© rasailojaraid.com

اور ’المصفیٰ‘ میں اختیار فرمایا تھا، جاری رہتا تو بڑی حد تک فقہی اختلافات کی شدت اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی ہی میں ختم ہو جاتی اور ملت اسلامیہ کے عوام الناس کے لیے دین پر چلنے کی ایک متفقہ شاہراہ سامنے ہوتی۔ مگر بدقسمتی سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فوراً بعد ہندوستان کا علمی مرکز ثقل دہلی سے لکھنو منتقل ہو گیا جہاں غالی اہل تشیع کی حکومت نے قرآن وحدیث کے درس کو ختم کرنے اور معقولات کی ترویج کی ہر امکانی کوشش کی۔ خود دہلی میں ابوالمنصور صفدر جنگ نے مغلیہ سلطنت پر غاصبانہ قبضہ کر کے یہی کچھ کیا۔

جہاں تک کہ مختلف فقہی مذاہب اور ان کے پیروکاروں کے جمود کا تعلق ہے تو شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ لوگوں کے مختلف اقوال کو شدّ ومدّ کے ساتھ بیان کرنا، ایک مخصوص شخص کے مذہب پر فتویٰ صادر کرنا، اس کے قول کو اختیار کر کے اسی کے مذہب ومسلک پر اعتماد کرنا پہلی اور دوسری صدی ہجری کے مسلمانوں کا دستور یا وطیرہ نہ تھا۔(۶) پھر فرماتے ہیں کہ یہی صورت ایک زمانہ میں اہل ایمان کو پیش آئی کہ مخصوص مسلک کے پیروکار ہونے کی وجہ سے باہمی منازعت شدت اختیار گئی اور لوگوں کے دلوں سے قرآن وحدیث کے صحیح فہم وادراک کی امانت رخصت ہوئی اور وہ تقلید میں پڑ کر دین کے معاملے میں غور وفکر سے بیگانہ ہو گئے۔ اب ان کے لیے یہ امر ہی باعث تسکین تھا کہ یہی سب ہمارے آبا واجداد بھی کیا کرتے تھے اور ہم انہیں کے نقش قدم پر گامزن ہیں۔(۷)

شاہ صاحب نے تقلید جامد کی مخالفت اور شدید مذمت کی اور تقلید کے ضمن میں ارباب فقہ کے غلو کو توڑنے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس وقت عالم اسلام کے ہر علاقے میں لوگ متقدمین کے فقہی مذاہب میں سے کسی ایک خاص مذہب کی پابندی کرتے ہیں اور اس سے خروج کو، چاہے وہ کسی ایک آدھ مسئلے میں ہی ہو، ملت سے نکل جانے کے مترادف سمجھتے ہیں، یوں جیسے اس مذہب کا امام کوئی نبی مبعوث ہو جس کی طاعت ان پر فرض کی گئی ہو۔(۸) چنانچہ آپ نے لوگوں میں تقلید کے جمود کو توڑنے کے لیے اور نصوص شرعیہ میں اجتہاد کی ضرورت کے پیش نظر آپ نے حدیث کے مطالعے اور اس کی تحقیق پر کافی زور دیا ہے۔ آپ نے تعصب کو بھولے سے بھی پاس نہ پھٹکنے دیا اور تفریع الفروعات اور تخریج المخرجات میں عدل وانصاف کے دامن کو ہاتھ سے کبھی نہ جانے دیا۔(۹)

حضرت شاہ صاحبؒ نے مروجہ تقلید پر شدید تنقیدیں بھی کی ہیں کہ لوگوں میں علمی شعور ومناسبت کم ہو گئی ہے۔ وہ قرآن وحدیث کے مقابلے میں عام اور غیر معصوم بشری آرا واقوال کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ ”چونکہ یہ قول ہمارے امام، مقتدا اور پیشوا کا ہے، لہٰذا یہ درست اور حرف آخر ہے“۔ اس صورت حال پر حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں سخت رد عمل ظاہر کیا(۱۰) بلکہ جب لوگوں میں یہ شدت مزید بڑھتی دیکھی تو اسے دین قیم میں تحریف کے اسباب میں شمار کیا، کیوں کہ لوگ دین حنیف کی اصل صورت سے اتنے بیگانہ اور دور گئے ہیں کہ غیر معصوم افراد کے ذہنی تخیلات اور تصورات کو اہمیت دیتے ہوئے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور حقیقی اسلامی مآخذ کو ترک کر دیتے ہیں۔(۱۱)

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امت مسلمہ میں یہ ذوق اور جذبہ اجاگر کرنا چاہیے کہ نصوص شرعیہ سے متفقہ طرق کے ذریعے راہنمائی حاصل کی جائے اور اس لحاظ سے صحابہ کرامؓ کو ایک مضبوط اتھارٹی سمجھا جائے۔ ہاں، اگر ان میں بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختلاف رائے نظر آئے تو پھر اصل نصوص شرعیہ کی طرف رجوع کرنے میں ہی بہتری ہے۔ فرماتے ہیں:

''چون صحابہ مختلف شوند و مأخذ اقوال ایشان از کتاب وسنت ظاہر شود تأمل در آن مأخذ باید کرد و از ان جہت باب ترجیح باید کشاد'' (۱۲)

''جب کسی مسئلے میں صحابہ کرامؓ کا آپس میں اختلاف ہو، نیز ان کے اقوال کے مأخذ قرآن وسنت سے ظاہر ہو جائیں تو اس صورت میں مأخذ ہی پر غور وفکر کیا جائے۔ اس سے کسی چیز کو راجح اور وزنی قرار دینے کا راستہ کھلے گا۔''

شاہ صاحب نے دیکھا کہ نصوص شرعیہ سے امت مسلمہ بے بہرہ ہو کر رہ گئی ہے جو کہ ایک خطرناک اور گھمبیر صورت حال ہے۔ لوگ اسلام کے بنیادی مآخذ سے دور ہو چکے ہیں اور ان کے رہنما و پیشوا اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے کی بجائے گمراہی وضلالت کی طرف لیے گامزن ہیں۔ اس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ اجتہاد سے عدم التفات ہے۔ ان دنوں برصغیر میں وعاظ اور مبلغین کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنی تقاریر میں بے محابہ موضوع اور محرف احادیث بیان کرتے تھے جس سے سادہ لوح، ضعیف اور رکیک القلب افراد دین اسلام سے اچھی طرح واقف نہ رہے تھے۔ (۱۳)

حضرت شاہ صاحبؒ کے دور کا آج کے دور کے ساتھ تقابل کیا جائے تو آسانی کہا جا سکتا ہے جو چیزیں حضرت شاہ صاحبؒ نے تجویز فرمائی تھی، بجا طور پر درست تھیں۔ خصوصاً عصر حاضر میں اختلافات کی شدت کم کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ زمین کی طنابیں کھینچ دی گئی ہیں اور پوری دنیا ایک بستی (گلوبل ولیج) بن چکی ہے اور پوری دنیا پر اہل شر وفساد اور معاندین اسلام کا پوری طرح تسلط قائم ہو چکا ہے۔ ان احوال میں فروعی اختلافات اور مسلک وذوق کے اختلافات میں فکر ولی اللہی کے مطابق اعتدال وتوازن اور وسعت ظرفی کے ساتھ تطبیق کی اشد ضرورت ہے۔ یہ اس دور کا اہم تقاضا ہے کہ فروعی اختلافات میں شدت کو ختم کر کے دین کو ایک متفقہ لائحہ عمل کے طور پر سامنے لایا جائے۔

حوالہ جات

۱۔ شبلی نعمانی: علم الکلام والکلام، (نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، ۱۹۷۹ء) ص ۸۷

۲۔ شاہ ولی اللہ: انصاف فی بیان سبب الاختلاف، (محکمہ اوقاف، لاہور، ۱۹۷۱ء) ص ۷۰

۳۔ شیخ محمد اکرام: رود کوثر، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء) ص ۵۳۶

۴۔ رحیم بخش: حیات ولی، (مکتبہ سلفیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء) ص ۲۹۶

۵۔ شیخ محمد اکرام: رود کوثر، ص ۵۸۲

۶۔ شاہ ولی اللہ: الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ۴۱

۷۔ المرجع السابق، ص ۶۶

۸۔ شاہ ولی اللہ: تفہیمات الٰہیہ، (مدینہ برقی پریس، بجنور) ۱/۲۰۹۔۲۱۰

۹۔ شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، (المکتبۃ السّلفیہ، لاہور، سن ندارد) ۱/۱۰

۱۰۔ شاہ ولی اللہ: عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، (مطبع مجتبائی، دہلی، سن ندارد) ۱/۲۔۷

۱۱۔ شاہ ولی اللہ: حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۱۲۱

۱۲۔ شاہ ولی اللہ: المصفی فی احادیث موطا (مکتبہ رحیمیہ، دہلی، سن ندارد) ۱/۲۷

۱۳۔ شاہ ولی اللہ: تفہیمات الٰہیہ، ۱/۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آرا و افکار

پروفیسر شیخ عبدالرشید*

مادری زبانوں کا عالمی دن۔ کیا ہم شرمندہ ہیں؟

زبان فکر و خیال یا جذبے کے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔ Oliver Wendell Holmes کے مطابق:

> "Language is the blood of the soul into which thoughts run and out of which they grow."

زبان ایک ایسا سماجی عطیہ ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل کو ملتا رہتا ہے اس طرح زبان انسان کی تمام پچھلی اور موجودہ نسلوں کا ایک قیمتی سرمایہ اور اہم میراث ہے۔ زبان ایک ایسے لباس کی طرح نہیں ہے کہ جسے اُتار کر پھینکا جا سکے بلکہ زبان تو انسان کے دل کی گہرائیوں میں اُتری ہوئی ہوتی ہے۔ یہ خیالات کی حامل اور آئینہ دار ہی نہیں ہوتی بلکہ زبان کے بغیر خیالات کا وجود ممکن نہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی ایسا خیال کہ جس کے لیے کوئی لفظ نہ ہو دماغ میں نہیں آ سکتا۔ شاید اسی لیے یونانی زبان کا ترجمہ کرتے ہوئے انسان کو حیوان ناطق کہا گیا۔ حیوان ناطق سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ انسان بول سکتا ہے، بولتے تو سب جانور ہیں اس سے مراد ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر بول سکتا ہے۔ لارڈ ٹینی سن (Lord Tennyson) نے کیا خوب کہا تھا کہ

> "Words like nature, half reveal
> And half conceal the soul within"

زبان انسانی زندگی کا اہم جُز ہے اسی لیے مولوی عبدالحق کہا کرتے تھے کہ ''زبان پر جو چوٹ پڑتی ہے، وہ زبان پر نہیں پڑتی، دلوں پر پڑتی ہے''۔ مقامی یا مادری زبانوں کو انسان کی دوسری جلد (Second Skin) بھی کہا جاتا ہے۔ مادری زبانوں کے ہر ہر لفظ اور جملے میں قومی روایات، تہذیب و تمدن، ذہنی و روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں، اسی لیے انہیں ہمارے مادی اور ثقافتی ورثے کی بقا اور اس کے فروغ کا سب سے مؤثر آلہ سمجھا جاتا ہے چنانچہ کسی قوم کو مٹانا ہو تو اس کی زبان مٹا دو تو قوم کی روایات اس کی تہذیب، اس کی تاریخ، اس کی قومیت سب کچھ مٹ جائے گی۔

---

*رجسٹرار یونی ورسٹی آف گجرات۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Berton کی کہاوت ہے کہ 'Help brezhoneg, breizh ebat"، یعنی (without Breton, there is no Brittany) (برٹن زبان کے بغیر برٹنی بھی نہیں ہے)۔ بلاشبہ مادری زبان کسی بھی انسان کی ذات اور شناخت کا اہم ترین جزو ہے اسی لیے اسے بنیادی انسانی حقوق میں شمار کیا جاتا ہے۔ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق پر بین الاقوامی معاہدے کے مشمولات کے علاوہ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، سائنس اور ثقافت کی قراردادوں کی صورت میں اس حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ قومیتی شناخت اور بیش قیمت تہذیبی وثقافتی میراث کے طور پر مادری زبانوں کی حیثیت مسلمہ ہے چنانچہ مادری زبانوں کے فروغ اور تحفظ کی تمام کوششیں نہ صرف لسانی رنگارنگی اور کثیر اللسانی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں بلکہ یہ دنیا بھر میں پائی جانے والی لسانی اور ثقافتی روایات کے بارے میں بہتر آگہی بھی پیدا کرتی ہیں اور عالمی برادری میں افہام وتفہیم، رواداری اور مکالمے کی روایات کی بنیاد بنتی ہے۔

اسی لیے اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم UNESCO کے رُکن ممالک کے نیز تنظیم کے صدر دفتر میں ہر برس 21 فروری کو مادری زبانوں کا عالمی دن (IMLD) منایا جاتا ہے اس دِن کا مقصد لسانی وثقافتی رنگارنگی اور کثیر اللسانیت کو فروغ دینا ہے۔ اس وقت کرۂ ارض پر انسان ۶۷۰۰ سے زیادہ زبانیں بولتے ہیں مگر ان مادری اور مقامی زبانوں کو چند زبانوں کے وائرس سے شدید خطرات لاحق ہیں۔ خاص طور پر انگریزی زبان دنیا کی ہزاروں مقامی زبانوں کو نگل گئی ہے اور ابھی بھی اس کی زبان خوری ختم نہیں ہوئی۔ چند اقوام اور طبقات کی لسانی دہشت گردی سے زبانیں محبت واُخوت کی بجائے نفرت وتقسیم کا موجب بننے لگی ہیں۔ اس سے عالمگیریت کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ عالمی امن کے لیے مادری اور مقامی زبانوں کا تحفظ واحترام ناگزیر ہے تاکہ لسانی رنگارنگی سے برداشت ورواداری کا کلچر فروغ پائے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۹۹ء میں یونیسکو کی انسانی ثقافتی میراث کے تحفظ کی جنرل کانفرنس کے اعلامیہ میں کہا گیا تھا کہ ہر سال ۲۱ فروری کو مادری زبانوں کا عالمی دن منایا جائے گا۔ ایسے زمانے میں جب عالمگیریت کی ترجیحات میں صرف چند زبانیں ہی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اقوامِ متحدہ اور یونیسکو نے لسانی تنوع اور کثیر اللسانی تعلیم وتدریس کے فروغ وتحفظ کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ مادری زبانوں کے عالمی دن کا تصور یونیسکو کو کینیڈا کی ایک تنظیم "Mother Language Lovers of the World" نے تجویز کیا اس پر یونیسکو کا کہنا تھا کہ یہ تجویز کسی ممبر ملک کی طرف سے آنی چاہیے۔ چنانچہ بنگلہ دیش نے یہ مہربانی کی اور اس دن کے لیے ۲۱ فروری کے دن کو بھی بنگالی زبان کی لسانی تحریک کے دن کے حوالے سے اہمیت دیتے ہوئے منتخب کیا گیا۔

مادری زبانوں کا عالمی دن مشرقی پاکستان میں ''لسانی تحریک کے دن'' ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کی یاد میں منایا جاتا ہے جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا لسانی مسئلے پر دفعہ ۱۴۴ کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ صبح سوا گیارہ بجے سے یہ ہڑتال اور احتجاج جاری تھا۔ دوپہر ۲ بجے دستور ساز اسمبلی کے اراکین کا راستہ روکا گیا تو پولیس حرکت میں آ گئی۔ سہ پہر ۳ بجے کے قریب فائرنگ ہوگئی جس سے طلبا عبدالجبار اور رفیق الدین احمد موقع پر جاں بحق ہو گئے جبکہ ابوالبرکات زخمی ہو کر رات ۸ بجے دم توڑ گیا۔ اس سے سارا مشرقی پاکستان سراپا احتجاج بن گیا۔ ۲۲ فروری کو بڑا احتجاج ہوا جس پر فائرنگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے۴ سے ۸لوگ مارے گئے ۔لسانی مسئلے پر ریاستی پولیس نے بنگالی بولنے والوں کا قتل عام کیا۔بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) میں لوگ غیر سرکاری طور پر یہ دن مناتے رہے، تاہم ۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ ۲۱ فروری کو حکومتی سرپرستی میں یہ دن منایا گیا اوراسی روز مادری زبان کی جدوجہد کی تحریک میں جاں بحق ہونے والوں کی یاد میں شہید مینار کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ پھر ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو بنگالی کو سرکاری سطح پر پاکستان کی بنیادی ریاستی زبانوں میں سے ایک کا درجہ دے دیا گیا۔یہی لسانی تحریک بعدازاں سقوط ڈھاکہ کا ایک اہم سبب ثابت ہوئی۔اسی دن کی یاد میں یونیسکو کے ممبر کی حیثیت سے بنگلہ دیش نے مادری زبانوں کے عالمی دن کی تجویز منظور کروائی۔

مادری زبانوں کے عالمی دن کے موقع پر آسٹریلیا میں مقیم ہنگری نژاد پروفیسر سٹیفن و ورم Stephen Wurm کو بھی خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے جو خود پچاس سے زیادہ زبانوں کو جانتا اور مہارت رکھتا ہے اور جس نے "Atlas of the world's Language in Danger of Disappeoring" مرتب کیا۔اس اٹلس میں پروفیسر سٹیفن وورم نے وضاحت کی ہے کہ اس وقت دنیا میں تین ہزار سے زیادہ مادری اور مقامی زبانیں خطرات کا شکار ہیں اور کرۂ ارض سے آہستہ آہستہ ماں بولیاں معدوم ہوتی جارہی ہیں ان کا تحفظ اور بقاء ضروری ہے ۔ مادری زبانوں کی بقاء اور تحفظ کی کاوشوں کے ثمرات کی ایک مثال انگلینڈ کی ایک مقامی ماں بولی کورنش "Cornish" کی ہے جو کہ متروک ہوگئی تھی مگر حالیہ کاوشوں سے اس ماں بولی کا کامیابی سے احیاء ہوا ہے اور اب ایک ہزار سے زائد لوگ کورنش زبان بولنے لگے ہیں۔ مادری زبانیں بطور ذریعۂ اظہار وابلاغ فرد کی شخصیت کی تشکیل وتکمیل میں موثر کردار ادا کرتی ہیں۔ چیک ری پبلک کے صدر Jan Kavan نے جنرل اسمبلی سے مادری زبانوں کے حوالے سے خطاب میں کہا تھا کہ

> "Mother Language is the most powerful instrument of preserving and developing our tangible and intangible heritage."

یونیسکو کے ۳۱ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲ نومبر ۲۰۰۱ء کے بعد یونیسکو نے ثقافتی رنگارنگی کے حوالے سے جاری کردہ عالمی اعلامیے کی منظوری دی جس میں یونیسکو کی تنظیم نے لسانی رنگارنگی کی حوصلہ افزائی کرنے والے رُکن ممالک کو مکمل تعاون فراہم کرنے کا عہد کیا۔زبانیں ہمارے مادی اور ثقافتی ورثے کی بقا اور اس کے فروغ کا سب سے مؤثر آلہ ہیں۔ مادری زبانوں کے فروغ اور تحفظ کی تمام کاوشیں نہ صرف لسانی رنگارنگی اور کثیر اللسانی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں بلکہ یہ دنیا بھر میں پائی جانے والی لسانی اور ثقافتی روایات کے بارے میں بہتر آگہی بھی پیدا کرتی ہیں اور عالمی برادری میں افہام وتفہیم، رواداری اور مکالمے کی روایات کی بنیاد پر بین الاقوامی یکجہتی کو بڑھاوا دینے کا اہم ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔لسانی اور ثقافتی رنگارنگی اُن آفاقی اقدار کی نمائندگی کرتی ہے جو معاشروں کے اتحاد اور ہم آہنگی کو تقویت دیتی ہیں۔لسانی رنگارنگی ہر انسان کے لیے اس کی مادری زبان اور خاص کر اس میں بنیادی تعلیم کی اہمیت کے ادراک نے یونیسکو جیسے ادارے کو مادری زبانوں کا عالمی دن منانے کے بارے میں فیصلہ کرنے پر مائل کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے بدقسمتی کے سوا کیا کہیے کہ مادرِوطن میں مادری زبانوں کے ساتھ سوتیلا سلوک عام ہے اور ہم نے عصری اور عالمی فکر و دانش سے بھی کچھ نہیں سیکھا۔ متحدہ پاکستان میں لسانی مسئلے سے دنیا بھر نے سبق سیکھ لیا اور عالمی سطح پر مادری زبانوں کا دن منایا جاتا رہے مگر ہم آج بھی لسانی رنگا رنگی کی مہک سے محروم اور زبانوں کے مسئلے کا شکار ہیں۔ ہم سے سبق سیکھ کر کئی ممالک نے اپنی لسانی پالیسوں کو از سرِنو مرتب کیا اور اب بہت سے ممالک اپنے علاقوں میں روایتی طور پر نظر انداز کی جانے والی یا خطرات سے دو چار زبانوں کو تحفظ اور فروغ دے رہے ہیں۔ جبکہ ہم آج بھی علاقائی، مادری اور قومی زبانوں کی کشمکش سے دو چار ہیں۔ ہمارے ہاں لسانی مسئلے نے جو گہرے اور منفی اثرات مرتب کیے، ان کی قیمت ہم ۱۹۷۱ء میں بھی چکا چکے ہیں۔ جمہوری ممالک میں جمہور کی زبان یا زبانیں ہی قومی یا سرکاری زبانیں ہوسکتی ہیں۔ عوام کا دل موہ لینے کے لیے عوام ہی کی بولی کارگر ہوسکتی ہے۔ ہم نے علاقائی اور مادری زبانوں سے جس سوتیلے سلوک کو روا رکھا اس کا خمیازہ ہم بھگت رہے۔ آج ہم تہذیبی شناخت اور تاریخی سانجھ سے محروم ہو کر قومیتی مسائل میں دھنس کر رہ گئے ہیں۔ ہم نے لسانی مسئلے کو غیر فطری طور پر حل کرنے کی کوشش کی اور قوم کو اپنی اپنی علاقائی زبانوں سے محروم کرنے کا جبر روا رکھا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری قوم نے کھرے، سچے اور سماجی تناظر میں سوچنے کی بجائے غیروں کی زبانوں سے غیروں کے انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ ہم نے انگریزی اور اردو کے ذریعے قومی یکجہتی کے حصول کی کوشش کی اور جارج برنارڈ شاہ کی اس بات کو فراموش کر دیا ہے کہ

"England and America are two countries divided by common language"

بلاشبہ پھولوں کی رنگا رنگی گلدستے کا حُسن اور طاقت ہوتی ہے قباحت اور کمزوری نہیں۔ جس قوم کو اپنی کوئی چیز اچھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر ادا پر فریفتہ ہو وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے۔ قوم بے جان افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہوتا بلکہ قوم معتقدات، تاریخ، عصبیت، ثقافت اور انفرادیت پر اصرار سے ہی وجود میں آتی ہے اور استحکام حاصل کرتی ہے۔ مذکورہ قومی عناصر کے اظہار کا اہم ذریعہ زبان ہی تو ہوتی ہے۔ جب لوگوں سے انکی زبان چھین لی جائے تو ان سے سب کچھ چھین لینے کے مترادف ہی ہوتا ہے۔ ہمیں بھی قومی یکجہتی کے گلدستے کی تشکیل کے لیے زبانوں کی رنگا رنگی کو اہمیت اور فروغ دینا ہوگا۔ ہمارے ہاں سندھی، پشتو، بلوچی، پنجابی، سرائیکی جیسی زبانیں ہماری اجتماعی غفلت کا شکار ہیں۔ جب تک ہم مادری زبانیں بولنا، انھی میں سوچنا اور انہیں تعلیم و تحقیق کا ذریعہ نہیں بنائیں گے قومی یکجہتی سے محروم رہیں گے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دینگے۔ مادری زبان کے ذریعے ہی وہ تعلیم و تربیت مانوس اور جانے پہچانے ماحول میں حاصل کر سکتا ہے۔ اپنے ماحول اور مٹی سے جڑے رہنے اور اس کے ساتھ اُنسیت سے ہی بچوں میں اعتماد، توازن، احساسِ ملکیت اور قومی یکجہتی پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں تعلیم و تدریس کے جدید نظریات میں بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہی دی جاتی ہے۔ آج کے جدید دور میں مادری زبان میں تعلیم بنیادی انسانی حق ہے۔ کسی ملک، علاقے یا صوبے کے لوگوں کو ان کی مادری زبان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے محروم رکھنا انسانی حقوق کی کُھلی خلاف ورزی ہے۔ کیا ایسی ریاستیں جہاں انسانی حقوق کی کُھلے عام خلاف ورزی ہو آئینی، قانونی، اخلاقی ، سیاسی اور سماجی حوالے سے جدید جمہوری ریاستیں کہلانے کی حقدار ہوسکتی ہیں؟ ستم ظریفی دیکھئے کہ پاکستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص ہمارا اجتماعی رویہ اور حکمرانی انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی کر رہا ہے اور ہم پھر بھی خود کو مہذب انسان سمجھنے کے فریب میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹر ہرشندر کور نے درست تجزیہ کیا ہے کہ مادری زبان بچے کی شخصیت کو اُبھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اپنی ماں بولی کو حقیر اور چھوٹا سمجھنے والے اپنے آپ کو اور اپنی تہذیب کو بھی کم تر اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور جن کی تہذیب حقیر ہو، وہ زمانے میں معتبر نہیں ہوسکتے۔ پنجابیوں نے پنجابی زبان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے، اس نے دھیرے دھیرے پنجابیوں کو ان کی اصل سے دور کر دیا ہے۔ ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کی زبان کے راستے میں رکاوٹ بنے۔

۲۱ فروری کو ہر سال منعقد ہونے والا مادری زبانوں کا عالمی دن ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے ہم کب تک اپنی مادری زبان سے یہ سلوک جاری رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے اپنی مادری زبان کے ساتھ جو کیا ہے ہم سب اس پر شرمندہ ہیں میں اپنی بات کو مشہور شاعرہ میری ڈوروکی نظم ''زبان کا سوگ'' پر ختم کرنا چاہتا ہوں جس کا ترجمہ خالد سہیل نے کیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ میری ڈوروکی یہ نظم ہمیں شرمندہ کر پاتی ہے کہ نہیں۔ کہتے ہیں کہ شرمندگی کا پسینہ قوموں کی زندگی میں ترقی کے سفر میں زادِ راہ کا کام کرتا ہے۔ میری ڈورو لکھتی ہے کہ

''زبان کا سوگ''

میں اپنی مادری زبان ڈائرنگن سے محروم ہوگئی ہوں
میں افسردہ ہوں
اس تباہی پر میری آنکھیں پرنم ہیں
میری زبان کے نرم و گداز الفاظ
چکنا چور ہوکر ماضی میں بکھر گئے ہیں
ہم پر جب انگریزی مسلط ہوگئی
تو ہم اپنی مادری زبان ڈائرنگن بُھلا بیٹھے
اور اسے تہذیب و ثقافت کی بھینٹ چڑھا دیا
اے میری مادری زبان
تمہیں کھونے پر
ہم بہت شرمندہ ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالات وواقعات

محمد عمار خان ناصر

بنگلہ دیش کا ایک مطالعاتی سفر

۱۰ر جنوری سے ۱۴ر جنوری ۲۰۱۰ء تک مجھے ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے Leaders of Influence Exchange Program (LOI) میں شرکت کے سلسلے میں بنگلہ دیش کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ یہ پروگرام US-AID یعنی یونائیٹڈ اسٹیٹس ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ اور ایشیا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد ہوا اور اس میں پاکستان، بھارت، نیپال، تھائی لینڈ اور افغانستان سے آئے ہوئے وفود نے شرکت کی۔ پاکستانی وفد میں راقم الحروف کے علاوہ شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی، بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان کے شعبہ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر محمد اکرم رانا اور اسلام آباد سے سماٹی وی کی نمائندہ محترمہ مریم وقار شامل تھیں۔ اس تین روزہ پروگرام کا بنیادی مقصد شرکا کو ان کوششوں اور تجربات سے متعارف کرانا تھا جو US-AID اور ایشیا فاؤنڈیشن، بنگلہ دیش میں اسلامک فاؤنڈیشن کے تعاون سے ائمہ اور خطبا کو سماجی ترقی میں متحرک کردار ادا کرنے اور مختلف سماجی مسائل ومشکلات کے حل کے لیے اپنی مذہبی حیثیت اور اثر ورسوخ کو استعمال کرنے کے سلسلے میں کر رہی ہے۔

تین روزہ پروگرام کا پہلا دن LOI پروگرام کے پس منظر، مقاصد، مختلف پہلوؤں اور اس میں کردار ادا کرنے والے اداروں، خاص طور پر اسلامک فاؤنڈیشن اور امام ٹریننگ اکیڈمی کے حوالے سے تعارفی بریفنگ کے لیے مخصوص تھا۔ دوسرے دن شرکا کو دو مختلف گروپوں کی صورت میں اس پروگرام کے بعض عملی مراکز اور سرگرمیوں کے مشاہدہ کے لیے چٹا گانگ اور سلہٹ لے جایا گیا، جبکہ تیسرے دن کے اختتامی سیشن میں شرکا کو خاص طور پر اس پہلو سے اپنے تاثرات کے اظہار کا موقع دیا گیا کہ اس پروگرام سے انھوں نے کیا سیکھا ہے اور وہ اپنے اپنے ملکوں کے مخصوص حالات میں عملی طور پر اس سے کیا رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

پہلے دن کے تعارفی سیشن میں یو ایس اے آئی ڈی کے مسٹر رسل پے پے، ایشیا فاؤنڈیشن بنگلہ دیش کے مسٹر نذر الاسلام اور اسلامک فاؤنڈیشن کے مسٹر مسعود اور مسٹر شہاب الدین کے علاوہ بنگلہ دیش کی قومی مسجد کے خطیب مولانا صلاح الدین نے گفتگو کی۔ ان سب حضرات کی گفتگو سے ہمیں جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

بنگلہ دیش میں رجسٹرڈ مساجد کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق ڈھائی سے تین لاکھ ہے اور ہر مسجد میں اوسطاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تین افراد امام، خطیب اور موذن وخادم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی آبادی پندرہ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور عام لوگوں میں مذہبی رجحان غالب ہے جس کا ایک مظہر یہ ہے کہ کم وبیش آٹھ کروڑ لوگ ہر جمعے کے دن جمعہ کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتے اور جمعے کا خطبہ سنتے ہیں۔ مساجد کے ائمہ وخطبا اور مذہبی راہ نماؤں کو عمومی طور پر احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور لوگ ان کی بات پر توجہ دیتے اور ان کی گفتگو کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اس تناظر میں بنگلہ دیش میں حکومتی سطح پر یہ احساس پیدا ہوا کہ مذہبی راہ نماؤں کے معاشرتی مقام ورسوخ کو بنگلہ دیش کے مختلف اور متنوع سماجی مسائل کے حل اور معاشرے کی ترقی جیسے مثبت مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے، چنانچہ ۱۹۸۹ء میں وزارت مذہبی امور کے تحت اسلامک فاؤنڈیشن کے نام سے ایک خود مختار ادارہ قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ بنگلہ دیشی ائمہ مساجد اور خطبا کو درپیش سماجی مسائل کے حوالے سے ادراک وشعور سے بہرہ ور کیا جائے، انھیں ان مسائل پر عوام کی راہ نمائی کی تربیت دی جائے اور انھیں آمادہ کیا جائے کہ وہ معاشرے کی بہبود اور ترقی کے لیے بھرپور، موثر اور قائدانہ کردار ادا کریں۔ اسلامک فاؤنڈیشن نے اس مقصد کے لیے امام ٹریننگ اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں ائمہ وخطبا کو ایک ۴۵ روزہ تربیتی کورس کے مرحلے سے گزارا جاتا ہے۔ اس تربیتی پروگرام کے نصاب میں چھ بنیادی موضوعات یعنی اسلامیات، توہمات کے خاتمے، ایڈز سے حفاظت کی تدابیر، پولٹری اور فشریز سے متعلق شرکا کو راہنمائی فراہم کی جاتی ہے۔ ۱۹۸۹ء سے اب تک بیس سال کے عرصے میں پینسٹھ ہزار ائمہ کو اس تربیتی مرحلے سے گزارا جا چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ۲۰۰۴ء سے US-AID اور ایشیا فاؤنڈیشن کے تعاون سے امام ٹریننگ اکیڈمی سے تربیت حاصل کرنے والے ائمہ کے لیے مزید تین روزہ تربیتی ورک شاپس کے انعقاد کا اہتمام کیا جاتا ہے جسے Leaders of Influence (LOI) Program کا عنوان دیا گیا ہے اور اس پروگرام کے تحت اب تک دس ہزار ائمہ کو اضافی تربیت دی جا چکی ہے۔

ہمیں بتایا گیا کہ امام ٹریننگ اکیڈمی سے تربیت پانے والے ائمہ اور خطبا کی سرگرمیوں اور خدمات میں حسب ذیل تبدیلیاں مشاہدے میں آئی ہیں:

o تربیت یافتہ ائمہ اپنے خطبات جمعہ میں بڑے اہتمام سے انسانی حقوق، سماجی انصاف، خواتین کے حقوق، کرپشن، ایڈز، تعلیم، خواتین اور بچوں کی اسمگلنگ، خاندانی منصوبہ بندی اور اس طرح کے دوسرے سماجی موضوعات پر گفتگو کرتے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عوام کی راہ نمائی کرتے ہیں۔

o بعض علاقوں میں امام حضرات نے خود بھی مچھلی فارم اور مرغی فارم قائم کیے ہیں جس سے وہ انفرادی طور پر اپنے ذرائع آمدن میں اضافے کے ساتھ ساتھ ملک کی خام قومی پیداوار (GDP) میں بھی اضافے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

o بعض علاقوں میں امام حضرات نے ماحولیاتی آلودگی سے بچاؤ کے لیے درختوں کی کاشت کاری کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ایک خاص علاقے میں امام حضرات کی کوشش سے پینتیس ہزار درخت لگائے گئے ہیں۔

o دیہی علاقوں میں ائمہ وخطبا ابتدائی تعلیم کے فروغ کے لیے مساجد کو بطور تعلیمی مراکز استعمال کر رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پروگرام کا دوسرا دن فیلڈ اسٹڈی کے لیے مخصوص تھا جس کے لیے پانچ ملکی وفود کو دو ٹیموں میں تقسیم کر کے افغانستان اور تھائی لینڈ کے وفود کو چٹا گانگ جبکہ پاکستان، بھارت اور نیپال کے وفود کو سلہٹ لے جایا گیا۔ سلہٹ میں ہم نے یو ایس اے آئی ڈی کے زیر اہتمام کام کرنے والے ایک مرکز صحت The Smiling Sun health Centre کا دورہ کیا جہاں متوسط اور زیریں طبقات کی خواتین کو علاج معالجہ کی ارزاں سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں اور جو مریض استطاعت نہ رکھتے ہوں، ان کا مکمل طور پر مفت علاج بھی کیا جاتا ہے۔ ہمیں اس سنٹر کے مختلف شعبے دکھائے گئے اور وفد کے شرکا نے ان شعبوں میں کام کرنے والے حضرات سے مختلف سوالات کر کے عملی تفصیلات معلوم کیں۔

اسی دن ہوٹل Fortune Garden سلہٹ میں ایشیا فاؤنڈیشن کے LOI پروگرام کے تحت ائمہ کے لیے ایک ورک شاپ جاری تھی جس میں ہمیں مہمان کے طور پر لے جایا گیا۔ یہاں ہم نے مختلف سماجی مسائل مثلاً کرپشن، خواتین کی اسمگلنگ، ناخواندگی، کثرت آبادی، ایڈز اور خواتین کے مسائل جیسے موضوعات پر آٹھ مختلف presentations سنیں جو شرکا نے مختلف گروپوں کی صورت میں باہمی مشاورت سے تیار کی تھیں اور ان میں ہر مسئلے کی مشکلات اور چیلنجز کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حل کے لیے عملی اقدامات تجویز کیے گئے تھے۔ خواتین کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ایک امام صاحب نے جن مشکلات کا ذکر کیا، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جیسے ہی کوئی امام یا خطیب منبر پر خواتین کے مسائل یا حقوق کی بات کرتا ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ امام صاحب ایک سیاسی تقریر کر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ مشکل لوگوں کی نہیں، بلکہ خود ائمہ اور خطبا کی پیدا کردہ ہے، کیونکہ لوگوں میں اس تاثر کا پیدا ہونا کہ خواتین کے مسائل یا حقوق کی بات مذہب سے نہیں بلکہ سیاست کے دائرے سے تعلق رکھتی ہے، خود مذہبی راہ نماؤں کی اس روش کا نتیجہ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے خطبات وتقاریر میں اس موضوع کو کبھی نہیں چھیڑتے، بلکہ اس موضوع کو مکمل طور پر اس طرح نام نہاد لبرل طبقات کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ خواتین کے حقوق یا مسائل کے حوالے سے اٹھنے والی کوئی بھی بحث عام طور پر قوم کو مذہبی اور غیر مذہبی کیمپوں میں تقسیم کر دیتی ہے جس میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کا علم لبرل طبقات کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور مذہبی طبقات ان کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے امام صاحب نے کثرت آبادی کے حوالے سے اپنی گفتگو میں یہ نعرہ دہرایا کہ ''بچہ، ایک ہی اچھا''۔ اس پر ہمارے وفد کی رکن محترمہ مریم وقار نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ ایک مولوی صاحب کی زبان سے انھوں نے یہ بات پہلی مرتبہ سنی ہے، کیونکہ عام طور پر مذہبی لوگ خاندانی منصوبہ بندی کو مطلقاً مذہبی تعلیمات کے منافی قرار دیتے ہیں۔

اسی نشست میں ایڈز یا نشے کے مریضوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے معاشرتی سلوک کا نکتہ زیر بحث آیا تو میں نے گزارش کی کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ نفرت گناہ سے کرنی چاہیے نہ کہ گناہ گار سے، اور خاص طور پر نشے یا اس کی طرح کی کسی دوسری علت میں گرفتار ہو جانے والے افراد ایک خطا کار اور کمزور انسان کی حیثیت سے اس بات کے مستحق ہیں کہ انھیں ہمدردی اور محبت کے ساتھ اس سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔ اس پر میں نے یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک صحابی شراب نوشی کی عادت کی وجہ سے بار بار پکڑ کر آپ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدمت میں لائے جاتے اور آپ کے حکم پر انھیں سزا دی جاتی۔ اسی طرح کے ایک موقع پر کسی شخص نے ان پر لعنت کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا کہ لا تعینوا الشیطان علی اخیہ، یعنی اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے مددگار نہ بنو۔ میں نے عرض کیا کہ مذہبی لوگ اسلام کی اس روحانی اور اخلاقی تعلیم کو معاشرے میں عام کرنے کے سلسلے میں زیادہ موثر کردار ادا کر سکتے ہیں اور انھیں یہ کردار بھرپور طریقے سے ادا کرنا چاہیے۔

۱۲ر جنوری کے دورۂ سلہٹ میں ہماری مصروفیات کا آخری حصہ سلہٹ میں امام ٹریننگ اکیڈمی کے سنٹر کا مختصر دورہ تھا۔ یہاں زیر تربیت ائمہ کی ایک کلاس کے سامنے اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر جناب فریدالدین نے مہمانوں کو اس تربیتی پروگرام کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے بریفنگ دی جس کے آخر میں مہمانوں میں سے ایک نمائندے سے اپنے تاثرات کے اظہار کی فرمائش کی گئی۔ یہ خدمت جناب ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی نے انجام دی اور اپنی مختصر لیکن موثر گفتگو میں حصول علم کے حوالے سے اسلامی نقطہ نظر حاضرین پر واضح کیا۔ ڈاکٹر فاروقی نے کہا کہ اسلام علم کے حصول کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور اس ضمن میں ذرائع اور ماخذ کے بارے میں متعصّبانہ رویے کی آبیاری کے بجائے یہ تلقین کرتا ہے کہ کوئی مفید بات جہاں سے بھی ملتی ہو، اسے لے لینا چاہیے۔ نیز یہ کہ اسلام میں دینی اور دنیاوی علم کی کوئی تفریق نہیں، کیونکہ علم اللہ کی صفت ہے اور اللہ کا علم ہر طرح کی باتوں کو محیط ہے، اس لیے مذہبی وغیر مذہبی اور دینی ودنیاوی ہر طرح کا علم اسلام کی نظر میں مطلوب ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کی گفتگو پر حاضرین نے بہت پرجوش انداز میں اپنے مثبت تاثر کا اظہار کیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹر فاروقی نے اپنی گفتگو میں انھی کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے جس پر وہ بے حد خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ وقت چونکہ بہت مختصر تھا، اس لیے تقریب کے اختتام پر منتظمین نے فوراً واپسی کا حکم نامہ جاری کر دیا اور زیر تربیت ائمہ سے گفتگو اور تبادلہ خیال نہ ہو سکنے کی تشنگی نہ صرف ہمیں بلکہ ائمہ کرام کو بھی محسوس ہوئی۔ میں ہال سے نکلنے والا آخری فرد تھا، چنانچہ ائمہ میرے قریب جمع ہونا شروع ہو گئے اور مصافحہ اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ ایک بزرگ امام صاحب نے فرط محبت سے مجھے سینے سے لگا لیا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ باقی سب مہمان جا چکے ہیں، میں جلدی سے اجازت لے کر نکلنے لگا کہ دور سے کچھ امام حضرات ''پاکستانی بھائی'' پکارتے ہوئے بھاگ کر آئے اور آ کر مصافحہ کیا۔ سب حضرات کی محبت دیدنی اور اپنے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے اور تبادلہ خیال کا اشتیاق دیدنی تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے منتظمین کو مداخلت کرنا پڑی اور انھوں نے آ کر ائمہ کرام کو سختی سے روک دیا اور مجھ سے کہا کہ آپ چلیے، کیونکہ گاڑیاں ڈھاکہ واپسی کے لیے تیار ہیں۔

پروگرام کے تیسرے روز آخری سیشن میں تمام شرکا سے فرداً فرداً اپنے تاثرات کے اظہار کی فرمائش کی گئی۔ میں نے عرض کیا کہ ان تین دنوں میں بنگلہ دیش کی حکومت، مذہبی طبقات اور سماجی مسائل سے دلچسپی رکھنے والی این جی اوز کے مابین تعاون واشتراک کی جو صورت حال ہمارے سامنے رکھی گئی ہے، وہ پاکستان کے معروضی تناظر میں بھی بے حد سبق آموز اور قابل استفادہ ہے، کیونکہ تیسری دنیا کے ممالک کے سیاسی اور سماجی مسائل کم وبیش ایک نوعیت کے ہیں اور ایک ملک کی معاشرتی صورت حال کے حوالے سے کیے جانے والے تجزیے اور اس ضمن میں کیے جانے والے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تجربات دوسرے ممالک کے لیے بھی اتنے ہی بامعنی اور مفید (relevant) ہوتے ہیں۔ میں نے اس ضمن میں پاکستان کے حوالے سے خاص طور پر تین نکات کی طرف توجہ دلائی:

ایک یہ کہ بنگلہ دیش میں مساجد کی عمارتوں اور ائمہ مساجد کی کھیپ کو ابتدائی سطح کی تعلیم کے فروغ کے لیے استعمال کرنے کا جو منصوبہ اس وقت روبعمل ہے، پاکستان میں اسی نوعیت کا ایک منصوبہ کافی عرصہ پہلے غالباً جنرل ضیاء الحق کے دور میں ''مسجد مکتب اسکیم'' کے نام سے شروع کیا گیا تھا جسے کاغذی سطح پر باقاعدہ منظوری حاصل ہونے کے باوجود بغیر کوئی ظاہری سبب بتائے ختم کر دیا گیا، البتہ باخبر ذرائع کے مطابق اس فیصلے کے پیچھے مذہب بیزار سیکولر بیوروکریسی کے یہ تحفظات کارفرما تھے کہ اگر نئی نسل کو سرکاری وسائل سے مساجد کے ائمہ کے ہاتھوں تعلیم اور تربیت کے مواقع فراہم کیے گئے تو یہ انتہا پسندی کے عمل (Radicalization) کو فروغ دینے کے مترادف ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ بنگلہ دیشی حکومت کا فیصلہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے سماجی مسائل اور مختلف سماجی طبقات کی صلاحیتوں اور ان سے استفادہ کے امکانات کے معاملے میں زیادہ forward-looking اور بصیرت کی حامل ہے اور پاکستان کے مقتدر طبقات کو اپنی محدود سوچ سے نجات حاصل کرنے اور ملک کی تعمیر وترقی کے لیے تمام طبقات کی صلاحیتوں اور کردار سے استفادہ کا حوصلہ اور بصیرت پیدا کرنے میں بنگلہ دیش کے اس تجربے سے بھرپور راہ نمائی لینی چاہیے۔

دوسرے یہ کہ بنگلہ دیش میں ائمہ مساجد کو سماجی موضوعات پر عوام کی راہ نمائی اور ان میں سماجی مسائل کے حل میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے جو منظم کوشش کی گئی ہے، اس سے بھی روشنی لی جانی چاہیے اور ائمہ وخطبا کے ہاں عمومی طور پر اپنے آپ کو مسجد کی چار دیواری تک محدود اور معاشرتی مسائل سے لاتعلق کر لینے کا جو مزاج پایا جاتا ہے، اس کی اصلاح کے لیے بنگلہ دیش کے ائمہ کے کردار اور سرگرمیوں کو ایک قابل تقلید نمونے کے طور پر سامنے رکھنا چاہیے۔

تیسرے یہ کہ مذہبی طبقات اور مختلف سماجی مسائل پر ارتکاز کرنے والی تنظیموں اور اداروں کے مابین باہمی رابطے کے فقدان اور اس سے جنم لینے والی بداعتمادیوں اور غلط فہمیوں کی فضا ہمارے ہاں بھی پوری طرح موجود ہے اور دونوں طرح کے طبقات ایک دوسرے کے بارے میں شدید تحفظات کا شکار ہیں۔ اس صورت حال کے ازالے کے لیے اسی طرح مختلف فورمز وجود میں آنے چاہییں جو فریقین کے مابین رابطے کا کام دیں، مختلف موضوعات پر مکالمے کا اہتمام کریں اور افہام وتفہیم پر مبنی ایک مثبت فضا میں سوسائٹی کے ان الگ الگ فکری دھاروں کو اس بات کا موقع بہم پہنچائیں کہ وہ ایک دوسرے کو براہ راست سمجھیں، تحفظات وخدشات پر باہم گفتگو کریں، ایک دوسرے کے زاویہ نظر اور تجربات سے استفادہ کریں، خیر خواہی اور ہمدردی پر مبنی تنقید کے ذریعے ایک دوسرے کی اصلاح کریں اور معاشرتی بہبود اور ترقی کے لیے باہمی تعاون کے امکانات اور دائروں کو دریافت کریں۔

اختتامی سیشن میں ہی ہر ملک کے نمائندہ وفود سے کہا گیا کہ وہ باہمی مشاورت کے بعد متعین نکات پر مبنی ایسا لائحہ عمل تیار کریں جو وہ بنگلہ دیش کے تجربے کی روشنی میں اپنے اپنے معاشرے کے معروضی حالات کے تناظر میں تجویز کر سکتے ہیں۔ پاکستانی وفد کے شرکا نے باہمی مشاورت سے حسب ذیل لائحہ عمل مرتب کیا جسے وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محترمہ مریم وقار نے شرکا کے سامنے پیش کیا:

o پاکستان میں ناخواندگی کو ختم کرنے اور ابتدائی سطح کی تعلیم کے فروغ کے لیے مسجد مکتب اسکیم کا احیا کیا جائے۔

o کسی مستند اور با اعتماد علمی ادارے (مثلاً دعوہ اکیڈمی) کے زیر اہتمام ائمہ وخطبا کی راہنمائی کے لیے مختلف سماجی ومعاشرتی موضوعات پر ماڈل خطبے تیار کروائے جائیں تاکہ موضوعات کے انتخاب اور مستند علمی مواد کی فراہمی میں خطبا کو سہولت ہو اور وہ معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں دین کا پیغام موثر طریقے سے لوگوں تک پہنچا سکیں۔

o ایسے فورمز قائم کیے جائیں جہاں معاشرے کے مختلف طبقات، خاص طور پر مذہبی وغیر مذہبی طبقات بلکہ خود مختلف مذہبی مکاتب فکر کو باہمی مکالمہ کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

o دینی مدارس سے وابستہ لوگوں کو دوسرے سماجی اداروں اور تنظیموں کا دورہ کروایا جائے اور ان کی سرگرمیوں اور خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ اسی طرح مختلف این جی اوز کو مدارس اور مذہبی اداروں کے دورے کروائے جائیں اور وہاں کے ماحول اور نظام کا براہ راست مشاہدہ کرنے کا موقع مہیا کیا جائے۔

o مختلف سماجی مسائل پر میڈیا میں جو تشہیری مہمیں چلائی جاتی ہیں، ان میں عام طور پر مذہبی راہ نما دیکھنے میں نہیں آتے، اس لیے میڈیا کو توجہ دلائی جائے کہ وہ رائے عامہ کو باشعور بنانے اور انھیں مطلوبہ اقدامات پر آمادہ کرنے کے لیے مذہبی راہ نماؤں کے اثر ورسوخ کو بھی استعمال کریں اور ان کے پیغامات کو شامل کر کے اپنی مہم کو زیادہ موثر بنائیں۔

o ائمہ وخطبا کی تربیت اور ان میں سماجی سطح پر موثر کردار ادا کرنے کی استعداد پیدا کرنے کے سلسلے میں دعوہ اکیڈمی کا تربیتی پروگرام بہت مفید ہے، لیکن وسائل کے لحاظ سے اس کا دائرہ بہت محدود ہے۔ یہ سلسلہ زیادہ بڑے اور وسیع پیمانے پر شروع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ائمہ وخطبا کو معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے عمل کا حصہ بنایا جا سکے۔

بہت سے دوسرے شرکا نے اپنی گفتگو میں جو نکات اٹھائے، ان میں سے اہم حسب ذیل ہیں:

بعض شرکا نے اس طرف توجہ دلائی کہ ائمہ مساجد اور خطبا کے وژن اور عملی کردار کے حوالے سے LOI پروگرام کے حقیقی عملی اثرات اور نتائج پر خاطر خواہ معلومات فراہم نہیں کی گئیں اور مہیا کردہ معلومات سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ تربیتی پروگراموں میں شریک ہونے والے ائمہ اور خطبا جب واپس اپنے ماحول میں جاتے ہیں تو کس حد تک مطلوبہ سماجی مسائل ومشکلات میں دلچسپی لیتے ہیں اور یہ کہ اس پروگرام کی قدر پیمائی (evaluation) کے لیے کوئی قابل اعتماد نظام موجود ہے یا نہیں۔ مسٹر رسل پےپے نے اس کے جواب میں بتایا کہ LOI پروگرام میں شرکت کرنے والے ائمہ اور خطبا کو کورس کے اختتام پر ایک گائیڈ بک مہیا کی جاتی ہے جس میں اس بات کی تفصیلی راہ نمائی موجود ہے کہ وہ مختلف سماجی مسائل کے حوالے سے عملاً کام کرنا چاہیں تو اس کا طریقہ کیا ہے اور اس ضمن میں وہ کون کون سے اداروں سے رابطہ کر کے مزید راہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مزید برآں ہر چار ماہ کے بعد شرکا کو ایک سوال نامہ بھیجا جاتا ہے اور اس کی مدد سے یہ جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ سماجی سطح پر کس حد تک مطلوبہ مقاصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں کا دورہ کر کے عملی صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسٹر رسل نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا کہ اس سے زیادہ فرداً فرداً ہر شخص کی کارکردگی جانچنے کا کوئی نظام ان کے پاس موجود نہیں ہے۔

ایک سوال یہ اٹھایا گیا کہ جن سماجی مقاصد کے لیے پروگرام ترتیب دیا گیا ہے، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ترقی پسندانہ (Progressive) ہیں جبکہ مذہبی لوگ قدامت پسند ہوتے ہیں تو انھیں ان مقاصد کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے پر کیونکر آمادہ کیا جا سکتا ہے؟ اس پر مسٹر رسل پے پے نے کہا کہ تربیتی پروگرام کے شرکا کو مختلف مراکز میں لے جا کر عملی صورت حال کا مشاہدہ کرنے اور اس طرح سماجی مسائل سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے جس سے ان کا exposure وسیع ہوتا ہے اور ان کے اندر کردار ادا کرنے کا داعیہ بیدار ہوتا ہے۔ انھوں نے مثال کے طور پر یہ واقعہ سنایا کہ ایک موقع پر پروگرام کے شرکا کو ایک HIV-AIDS سنٹر لے جایا گیا جہاں ایڈز سے متعلق لوگوں کو راہنمائی فراہم کی جا رہی تھی۔ وہاں ایک نوجوان قحبہ (Prostitute) بھی موجود تھی۔ شرکا سے جب اس کا تعارف کرایا گیا تو ایک مولوی صاحب نے بہت سخت لہجے میں اسے وعظ کرنا شروع کر دیا کہ تم جو کام کرتی ہو، وہ حرام اور گناہ ہے، اس لیے تمہیں چاہیے کہ اس پیشے کو فوراً ترک کر دو۔ اس کے جواب میں اس خاتون نے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ اس پیشے سے وابستہ خواتین یہ پیشہ شوق سے نہیں، بلکہ غربت اور مجبوری کی وجہ سے اختیار کرتی ہیں، اس لیے اگر آپ لوگ ان کفالت کا ذمہ اٹھا لیں تو وہ یہ پیشہ چھوڑ دینے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری یہ کہ آپ جیسی معزز اور شریفانہ شکل وصورت رکھنے والے حضرات دن کے وقت ہمیں گناہ اور ثواب کا وعظ کرتے ہیں اور رات کو ہماری خدمات حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس پہنچے ہوتے ہیں جو ایک منافقانہ روش ہے۔ خاتون کی اس بات پر مولوی صاحب ذرا ٹھنڈے ہوئے اور انھیں اندازہ ہوا کہ اس نوعیت کے سماجی مسائل اتنے سادہ نہیں ہوتے کہ انھیں محض وعظ کے ذریعے حل کیا جا سکے۔ مسٹر رسل نے یہ واقعہ بطور مثال بیان کر کے کہا کہ ان کا ادارہ ائمہ اور خطبا کو اسی طرح مشاہدہ، تجربے اور میل جول کے ذریعے سماجی مسائل اور ان کی پیچیدگیوں سے عملی طور پر روشناس کرانے کی کوشش کرتا ہے اور اس مقصد میں انھیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ (اس پر مجھے چند سال قبل عالمی ادارۂ صحت کی وہ رپورٹ یاد آ گئی جس میں ایشیائی ممالک میں جسم فروشی کے کاروبار اور اس کے ساتھ وابستہ خطرات اور بیماریوں کی نشان دہی کے باوجود یہ کہا گیا تھا کہ بعض ممالک میں اس کاروبار پر علی الفور قانونی پابندی عائد کرنے کی سفارش نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ غربت اور افلاس کا یہ عالم ہے کہ بے شمار خواتین محض جسم وجان کا تعلق قائم رکھنے کے لیے بھی اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہیں۔)

مسٹر نذر الاسلام نے اس پر مزید یہ اضافہ کیا کہ ایک امام صاحب جو پہلے اپنے خطبات جمعہ میں ایڈز کا شکار ہونے والے مریضوں کے خلاف سخت تقریریں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ حرام کاری اور گناہ میں ملوث ہیں، اس لیے انھیں سماج میں الگ تھلگ کر دینا چاہیے، LOI پروگرام کے ذریعے اس مسئلے سے قریبی واقفیت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ایک ماڈل خطبہ تیار کیا ہے جس میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کی راہ نمائی کی گئی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں۔ (اس موقع پر مجھے وہ حدیث یاد آ گئی جس میں بیان ہوا ہے کہ جب ایک شخص نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رات کے اندھیرے میں نادانستہ صدقے کا مال ایک چور اور ایک بدکار عورت کو دے دیا اور پھر پتہ چلنے پر اپنے صدقے کے رائیگاں چلے جانے پر افسوس کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے خواب میں یہ بتایا گیا کہ اس کا صدقہ ضائع نہیں ہوا، کیونکہ عین ممکن ہے کہ اس رقم سے اپنی ضرورت پوری ہو جانے کی وجہ سے چور، چوری سے اور بدکار عورت بدکاری سے باز آ گئی ہو۔)

اختتامی سیشن میں ایشیا فاؤنڈیشن بنگلہ دیش کے نمائندہ مسٹر حسان نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے جب وہ ایشیا فاؤنڈیشن کے ساتھ وابستہ ہوئے اور انھیں LOI پروگرام کا علم ہوا تو وہ اس کی کامیابی کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار تھے اور ان کا خیال تھا کہ امام صاحبان خاصے قدامت پسند ہوتے ہیں اور صرف مذہبی موضوعات پر ہی بات کرنا پسند کرتے ہیں، اس لیے انھیں سماجی مسائل کے حوالے سے کوئی مثبت کردار ادا کرنے پر آمادہ کرنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوگی، لیکن عملی تجربے کے بعد اب ان کے شکوک وشبہات باقی نہیں رہے۔ مسٹر حسان نے بتایا کہ انھوں نے ایک پروگرام کے شرکا کے ساتھ تبادلہ خیال کیا تو وہ ان کے خیالات سن کر بے حد متاثر ہوئے، کیونکہ امام صاحبان ان مسائل میں گہری دلچسپی لے رہے تھے اور بہت اشتیاق اور گہرے مخلصانہ جذبے کے ساتھ معاشرتی اصلاح اور سماجی تبدیلی کے لیے متحرک کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔

مسٹر رسل پے پے نے کہا کہ LOI پروگرام کے سلسلے میں انھیں عملی طور پر جس مشکل کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ مذہبی لوگوں اور لبرل طبقات کے مابین بداعتمادی کی فضا ہے، کیونکہ مذہبی لوگوں کے ذہنوں میں این جی اوز کا ایک عجیب وغریب تصور جاگزیں ہے اور لبرل طبقے مذہبی لوگوں کا نام سنتے ہی بدک جاتے ہیں۔

بنگلہ دیش کا یہ تین روزہ دورہ وہاں کے مذہبی ولبرل طبقات کے باہمی تعاون واشتراک پر مبنی اس سماجی تجربے کے بارے میں جاننے کے حوالے سے بے حد مفید رہا اور مجھے ذاتی طور پر اس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، البتہ ایک تشنگی محسوس ہوتی رہی کہ پورے پروگرام میں نہ تو منتظمین کی طرف سے اس کا اہتمام کیا گیا تھا کہ مہمانوں کو LOI پروگرام کے تحت تربیت حاصل کرنے والے ائمہ اور خطبا کے ساتھ براہ راست تبادلہ خیال کا موقع فراہم کیا جائے اور نہ شیڈول میں اس کی گنجائش نکل سکی کہ ازخود اس کا موقع پیدا کر لیا جائے۔ میری خواہش تھی کہ اس تجربے کے حوالے سے خود ائمہ اور خطبا کے خیالات وتاثرات نیز خدشات اور تحفظات براہ راست ان سے معلوم کیے جائیں تاکہ صورت حال کا معروضی تجزیہ کرنے میں مدد مل سکے، لیکن افسوس کہ اس کا کوئی مناسب موقع نہ مل سکا اور منتظمین کے مرتب کردہ بے لچک شیڈول میں رسمی علیک سلیک کے علاوہ ہم بنگلہ دیش کے ائمہ وخطبا سے کوئی تفصیلی تبادلہ خیال نہ کر سکے۔ میری تجویز ہوگی کہ اس نوعیت کے آئندہ پروگراموں میں یہ پہلو بطور خاص شیڈول کا حصہ بنایا جائے اور مقامی ائمہ وخطبا کے ساتھ مہمانوں کی ملاقات اور تبادلہ خیال کے لیے ایک مستقل سیشن وقف کیا جائے تاکہ انھیں ایک کھلے ماحول میں اس تجربے میں شریک تمام فریقوں کا زاویہ نگاہ سمجھنے اور اپنے تجزیے کی بنیاد مکمل اور براہ راست حاصل کردہ معلومات پر رکھنے میں مدد ملے۔

۱۱/ جنوری کی شب کو یو ایس اے آئی ڈی کے نمائندہ مسٹر رسل پے پے نے مہمانوں کے اعزاز میں اپنی رہائش گاہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر ایک پرتکلف عشائیے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مسٹر رسل پے پے کیتھولک ہیں اور کینیڈا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کیتھولک مسیحیوں کی روایتی مذہبی اسپرٹ پوری طرح زندہ محسوس ہوئی اور انھوں نے متعدد مواقع اپنے کیتھولک ہونے کا ذکر بڑے تاثر کے ساتھ کیا۔ آخری ملاقات میں جب میں نے ان سے کہا کہ میں نے آپ کا ای میل ایڈریس لے لیا ہے اور ان شاءاللہ ہم رابطے میں رہیں گے تو انھوں نے ''ان شاءاللہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں بھی بالکل یہی روایت ہے، کیونکہ میری والدہ کیتھولک تھیں اور جب میں تعلیم کے زمانے میں ہاسٹل سے انھیں فون پر بتاتا کہ اس ویک اینڈ پر میں ان سے ملنے آؤں گا تو وہ کہتیں: God willing، یعنی ان شاءاللہ۔

مسٹر رسل کی رہائش گاہ پر ہماری ملاقات کینیڈا ہی کے ایک دراز قد، ذہین اور خوش مزاج نوجوان Daniel Jones سے ہوئی۔ جب میری پہلی نظر ڈینئل پر پڑی تو وہ نیپال سے آئے ہوئے ہمارے نوجوان دوست نرجن رائے سے محو گفتگو تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کی گفتگو میں مخل ہوتے ہوئے دونوں سے مصافحہ کیا اور مذاق کے طور پر ڈینئل سے پوچھا کہ کیا آپ بھی نیپال سے ہیں؟ وہ حیرانی سے بولے کہ کیا میں شکل سے نیپالی لگتا ہوں؟ میں نے کہا کہ مجھے بھی اسی بات پر حیرت ہے کہ آپ شکل سے تو نیپالی نہیں لگتے۔ میرے اس مذاق پر وہ بہت ہنسے اور ہمارے درمیان فوراً بے تکلفی کی فضا قائم ہو گئی۔ ڈینئل نے بتایا کہ وہ سوشل سائنسز میں ایم فل کی ڈگری کے امیدوار ہیں اور اپنے مقالے کی تکمیل ہی کے سلسلے میں بنگلہ دیش آئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے مقالے کا عنوان پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ انھوں نے "Men's Sexual Health" (مردوں کی جنسی صحت) کے موضوع پر ریسرچ کی ہے اور ان کا مقالہ www.icddrb.org پر دستیاب ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو بہت دلچسپ اور حساس موضوع ہے تو ڈینئل نے اس کی تائید کی اور کہا کہ یہاں بنگلہ دیش میں انھیں لوگوں سے اس موضوع پر بات کرنے اور ان سے معلومات حاصل کرنے میں خاصی دقت پیش آئی، کیونکہ مشرقی معاشروں میں جنسی مسائل اور موضوعات پر سنجیدہ گفتگو نہیں کی جاتی۔ ڈینئل نے کہا کہ یہاں بے شمار لوگ شادی سے پہلے جنسی تعلق قائم کرتے ہیں، موبائل فون پر جنسی تفریح کرتے ہیں اور مختلف جنسی مسائل اور بیماریوں کا شکار ہیں، لیکن اس پر گفتگو کرنے سے شرماتے ہیں۔ ڈینئل نے بتایا کہ انھوں نے نوجوانوں سے اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک دلچسپ طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ وہ کالج یا یونی ورسٹی میں کسی جگہ جا کر بیٹھ جاتے اور بہت سے نوجوان یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک انگریز یہاں بیٹھا ہوا ہے، تجسس سے ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتے اور ان سے مختلف سوال کرنا شروع کر دیتے کہ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو اور کس مقصد کے لیے بنگلہ دیش آئے ہو؟ اس طرح آہستہ آہستہ وہ ان نوجوانوں سے بے تکلفی پیدا کر لیتے جو مطلوبہ معلومات کے حصول کے لیے خاصی مدد دیتی۔

ڈینئل نے کہا کہ ان کا مشاہدہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش کی نئی نسل مختلف عوامل کے تحت زیادہ کھلے ذہن سے سوچتی ہے اور بہت سے سوالات پر از سر نو غور کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے کہا کہ پاکستان میں بھی بلکہ کم و بیش ہر جگہ یہی صورت حال ہے۔ ڈینئل نے پوچھا کہ تم اس صورت حال کو کیسے دیکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ ایک اچھی اور مثبت تبدیلی ہے۔ ایک مولوی کے منہ سے یہ جواب سن کر ڈینئل خاصے حیران ہوئے اور پوچھا کہ کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرو گے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے کہا کہ میری رائے میں اس وقت ہمیں سیاسی، سماجی اور مذہبی سطح پر جو مسائل درپیش ہیں، ان کا ایک بڑا سبب بہت سے لگے بندھے خیالات (Stereotypes) ہیں جو ایک تیزی سے بدلتے ہوئے سماج میں اپنی معنویت کھو چکے ہیں، اس لیے اگر نئی نسل سوالات اٹھانے اور نئے سرے سے مسائل پر غور کرنے پر آمادہ ہے تو یہ یقیناً ایک مثبت چیز ہے جسے اگر دانش مندی اور بصیرت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ درپیش مسائل کے حل میں کارآمد ثابت ہوگی۔

۱۴ر جنوری کو ہم بنگلہ دیش سے واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارا سفر امارات کی ایئر لائن کے ذریعے سے تھا، چنانچہ ۱۴ اور ۱۵ جنوری کی درمیانی شب ہمیں دوبئی ایئر پورٹ پر گزارنا پڑی۔ دبئی ایئر پورٹ فی الواقع بہت بڑا ہے اور سہولتوں اور انتظامات کے لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے بہترین ایئر پورٹوں میں ہوتا ہے۔ ہم نے بارہ گھنٹے کو محیط اپنے قیام کا وقت زیادہ تر یہاں بنائی گئی وسیع وعریض مارکیٹ کی دوکانوں پر گھومتے پھرتے گزارا۔ دبئی ایک اسلامی ملک ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کے ایک بڑے تجارتی مرکز کی حیثیت بھی حاصل ہے اور مشرق ومغرب کے عین وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے دبئی ایئر پورٹ دنیا بھر کے مختلف ملکوں، نسلوں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے مسافروں کی اجتماع گاہ ہے۔ ایک طرف روایتی طور پر اسلام کے ساتھ وابستگی کے تقاضوں کو نباہنے اور دوسری طرف دنیا بھر کے سیاحوں اور کاروباری لوگوں کے لیے کشش پیدا کرنے کی خواہش کی بدولت یہاں کی حکومتی پالیسیوں میں 'دین' اور 'دنیا' کا ایک عجیب امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ اس 'امتزاج' کا نمونہ ایئر پورٹ پر بھی دیکھنے کو ملتا ہے جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ مسجدیں موجود ہیں اور ہر نماز کے لیے لاؤڈ اسپیکر پر باقاعدہ اذان دی جاتی ہے جو ایئر پورٹ کے ہر کونے میں سنائی دیتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ شراب کی بڑی بڑی دکانیں بھی پوری آب وتاب کے ساتھ سجی ہوئی ہیں جہاں دنیا بھر سے منگوائی جانے والی مختلف برانڈ کی مہنگی ترین اور نفیس ترین شرابیں سرعام میسر ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ سوائے تجارتی مقاصد یا لبرل ازم کی نمائش کے، ایسی کون سی حقیقی مجبوری ہو سکتی ہے جس کے تحت ایک مسلمان ملک کے ایئر پورٹ پر ام الخبائث کی ایسی پر رونق دکانیں سجانے کی اجازت دی جائے۔ بنگلہ دیش کے ایئر پورٹ پر بھی یہی منظر دیکھنے میں آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ملک کے ایئر پورٹ اس ''کفر بواح'' سے محفوظ ہیں۔ جناب ڈاکٹر یوسف فاروقی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ عرب امارات کے حکمرانوں نے اس خطے کے جغرافیائی محل وقوع اور خدا کے دیے ہوئے وسائل کے تناظر میں دنیا بھر کے تاجروں کی توجہ حاصل کرنے اور عالمی سرمایے کو کھینچ کر یہاں لانے کے لیے تو بہت منظم منصوبہ بندی کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ عالمی روابط اور مشرق ومغرب کی قوموں کے اختلاط کے اس ماحول کو اسلام کا پیغام دنیا تک پہنچانے کے لیے استعمال کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی۔ میرے ذہن میں آیا کہ یہاں شراب کی دکانوں جتنا بڑا نہ سہی، لیکن کسی نمایاں جگہ پر اگر ایک ایسا ڈیسک قائم کیا جاتا جہاں دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن وحدیث اور کتب سیرت کے تراجم اور اسلامی تعلیمات کے تعارف پر مبنی لٹریچر مفت دستیاب ہوتا اور اس منصوبے کو حکومت امارات کی سرپرستی حاصل ہوتی تو شاید وہ خدا کے دیے ہوئے مال کے بارے میں 'فیم انفقه' کے سوال کا بہتر جواب دینے کی پوزیشن میں ہوتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دبئی ایئر پورٹ کی مختلف دکانوں پر کاروباری خندہ پیشانی چہرے پر سجائے مرد اور خواتین تو ہر جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں، لیکن مجھے یہاں ایک حقیقی خوش اخلاقی کا تجربہ بھی ہوا۔ ایک بک اسٹال پر کتابیں دیکھتے دیکھتے مجھے مشہور امریکی مستشرق جان ایل اسپوزیٹو کی کتاب ''Who Speaks for Islam?'' کا عربی ترجمہ بعنوان ''من یتحدث باسم الاسلام؟'' نظر پڑ گیا جو دار الشروق، مصر کے زیر اہتمام طبع ہوا ہے۔ کتاب پر قیمت ۴۸ درہم درج تھی، جبکہ میرے پاس کھلی رقم ۴۵ درہم کی تھی اور سردست کوئی بڑا نوٹ کھلا کرانے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں کتاب کاؤنٹر پر کھڑی سیلز گرل کے پاس لے گیا، جس کا تعلق غالباً فلپائن یا کوریا سے تھا، اور اس سے پوچھا کہ کیا تم یہ کتاب مجھے ۴۵ درہم میں دے سکتی ہو؟ اس نے ذرا تردد کے بعد پوچھا کہ کیا تمھارے پاس صرف ۴۵ درہم ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، اتنے ہی دے دو۔ میں نے جیب سے ۴۵ درہم نکال کر اسے دے دیے، لیکن جب اس نے مشین سے بل نکال کر میرے ہاتھ میں تھمایا تو وہ ۴۸ درہم کا تھا۔ مجھے اس پر سخت خلش محسوس ہوئی، کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ رعایت کر کے قیمت میں سے ۳ درہم کم کر دے گی، لیکن غالباً یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ میں پلٹ کر اس کے پاس گیا اور کہا کہ بل پر تو قیمت ۴۸ درہم ہی درج ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تین درہم یقیناً تمھیں اپنے پاس سے ادا کرنا پڑیں گے جو مجھے ہرگز پسند نہیں۔ اس پر وہ ہنس پڑی اور تھوڑا سوچ کر کہنے لگی کہ ہمارے پاس حساب کتاب کی کمی بیشی کو پورا کرنے کے لیے کچھ زائد رقم موجود ہوتی ہے۔ تاہم میں مطمئن نہیں ہوا اور اس سے کہا کہ میرے پاس درہم تو نہیں، البتہ سو ڈالر کا نوٹ موجود ہے، تم اس میں سے یہ رقم منہا کر لو، لیکن اس نے انکار کر دیا اور اصرار سے کہنے لگی کہ تم کتاب لے جاؤ، یہ صرف تین درہم کی تو بات ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بڑے تردد کے ساتھ وہاں سے چلا آیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد سو درہم کا نوٹ لے کر دوبارہ اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اس میں سے تین درہم کاٹ لو۔ اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا اور بڑی معصومیت سے بار بار It's OK, sir (بس ٹھیک ہے جناب) کہتی رہی۔ میں پھر وہاں سے واپس چلا آیا، لیکن کافی دیر کے بعد جب کچھ مزید خریداری کرتے ہوئے میرے پاس چند سکے جمع ہو گئے تو میں تین درہم کا قرض ادا کرنے کے لیے خاصا فاصلہ طے کر کے دوبارہ اسی بک اسٹال پر پہنچ گیا، لیکن اب کاؤنٹر پر ایک دوسری خاتون کھڑی تھی۔ میں نے صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے تین درہم اس کو دیے اور وہاں سے واپس آ گیا۔

۱۵ جنوری کو رات کے پچھلے پہر امارات کی ایئر لائن دوبئی سے روانہ ہو کر صبح ۸ بجے کے قریب اسلام آباد ایئر پورٹ پر اتری اور اس طرح یہ مطالعاتی سفر اختتام کو پہنچا۔ میں ان تمام اداروں اور حضرات کا شکر گزار ہوں جن کے تعاون اور انتظام سے اس تین روزہ مطالعاتی دورے میں شرکت اور استفادہ کا موقع میسر ہوا۔ بنگلہ دیش میں قیام ایک پرسکون اور دوستانہ ماحول میں رہا جس کے لیے ایشیا فاؤنڈیشن بنگلہ دیش کے منتظمین کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے، جبکہ ایشیا فاؤنڈیشن، پاکستان کی سینئر پروگرام آفیسر محترمہ نادیہ طارق علی اور ان کے معاونین اس پہلو سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بعض الجھنوں کے باوجود بڑے خلوص اور دلچسپی کے ساتھ کوشش کر کے اس سفر کو ممکن بنایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مباحثہ ومکالمہ

زاہد صدیق مغل*

اسلامی بینکاری: غلط سوال کا غلط جواب (۳)

۳) اسلامی بینکنگ کے امکانات کا جائزہ

بینکنگ کے درست تصور کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم اس کی اسلامیت کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بحث کو ہم درج ذیل امور پر تقسیم کرتے ہیں۔

۳.۱: بینکنگ کی شرعی حیثیت

جیسا کہ ابتدائی مضمون میں ذکر کیا گیا تھا کہ بینکنگ کی اسلام کاری ممکن ہونے کا دعوی دو شرائط کی تکمیل پر منحصر ہے۔ اول fractional reserve banking کا شرعاً جائز ہونا، دوئم نظام بینکاری کو سود کے بجائے بیع میں تبدیل کر لینا۔ مجوزین بینکاری نظام کا غلط تصور قائم کرنے کی وجہ سے صرف 'غیر سودی بینکاری' کے امکانات کی ثانوی بحث میں الجھے رہتے ہیں، گویا ان کے نزدیک بینکنگ کی واحد خرابی اس کا 'سود' استعمال کرنا ہے، اور جواز بینکاری کی ساری بحث کو وہ اسی ایک مسئلے پر مرتکز کر دیتے ہیں۔ اس ناقص فہم کے باعث وہ fractional reserve banking کی پوری بحث پس پشت ڈال دیتے ہیں، جبکہ بینکنگ کی اسلام کاری ممکن ہونے کی بحث میں بینک کا سودی یا غیر سودی ہونا ثانوی مسئلہ ہے بنیادی بحث یہ ہے کہ بینک جو زر تخلیق کرتا ہے اسکی شرعی حیثیت کیا ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل درج بالا گفتگو سے اخذ ہونے والے تین اہم مقدمات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے:

ا۔ جب تک اکانومی میں ایک ایسا ایجنٹ موجود رہے گا جو بیک وقت لوگوں سے رقم (deposit) وصول بھی کرے اور ادھار (financing) بھی دے، اس وقت تک 'فرضی زر کی تخلیق' کا عمل جاری رہے گا اور یہ ایجنٹ (یا ادارہ) لازماً (جعلی) 'قرض کی رسید' (promise of payment) کو آلہ مبادلہ (means of payment) کی حیثیت دے کر اصل زر کے خاتمے کا باعث بنے گا۔ ظاہر ہے اگر بینک ڈپازٹس (جو promise of payments کی رسید ہوتے ہیں) کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنے کی اجازت نہ ہو تو اس صورت میں بینک کی قرض دینے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی اور وہ محض ایک ایسے ادارے کی حیثیت اختیار کرلے گا جہاں لوگ اپنی امانت حفاظتی

---

* نیشنل یونی ورسٹی فاسٹ، کراچی۔ zahid_12feb@yahoo.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقطہ نگاہ سے جمع کراتے ہوں۔ مگر ایسے کسی ادارے کو کسی بھی تعریف (یہاں تک کہ مجوزین کی تعریف) کی رو سے بینک نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ ثمن حقیقی پر مبنی مالیاتی نظام میں 'بیت المال' وغیرہ تو ہو سکتے ہیں، مگر بینک نہیں ہو سکتے۔

۲۔ لہٰذا بینکنگ 'صرف اور صرف' ایک ایسے مالیاتی نظام ہی میں ممکن ہے جہاں ثمن حقیقی یا اصل زر کے بجائے قرض پر مبنی زر (promise of payment) بطور آلہ مبادلہ (means of payment) استعمال ہو اور ایک ایسا مالیاتی نظام جہاں ثمن حقیقی یا اصل زر بطور قانون رائج ہو وہاں بینک کا وجود کالعدم ہو جائے گا۔ یعنی وجود بینکنگ کے لیے لازم ہے کہ قرض لوگوں کا ذاتی معاملہ نہ رہے بلکہ اسے بطور آلہ مبادلہ استعمال کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ اکانومی میں ایک شخص قرض دینے اور ڈپازٹس وصول کرنے کا کام بھی کر رہا ہو مگر قرض کی رسید بطور آلہ مبادلہ استعمال نہ ہو رہی ہو۔

۳۔ یہی وجہ ہے کہ بینکنگ کو شرکت و مضاربت کے اصولوں پر چلانا ناممکن ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شرکت و مضاربت کے معاہدات میں تخلیق زر کی صورت قطعاً پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ 'نجی معاہدات' ہوتے ہیں نہ کہ آلہ مبادلہ کے طور پر استعمال ہونے والے مالی دعوے۔ شرکت و مضاربت کے اصولوں پر بینکاری ممکن ہونے کا وہم صرف انہی حضرات کو ہو سکتا ہے جو بینک کو غلط طور پر زری ثالث سمجھ بیٹھے ہوں۔ (۲۱)

ان بنیادی مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد نظام بینکاری کی شرعی حیثیت سمجھ لینا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ اس گفتگو کے دو تناظر ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ بینک ڈپازٹس کی شکل میں جو زر تخلیق کرتا ہے، وہ 'جعلی قرض کی رسید' ہوتا ہے۔ دوئم یہ زر کسی حقیقی اثاثے کی بنیاد پر قائم شدہ قرض ہوتا ہے۔ (یہ دوسری صورت محض بحث کے لیے فرض کی گئی ہے، کیونکہ fractional reserve banking میں یہ بہر حال امر محال ہے)۔

بینک زر بطور حقیقی قرض کی رسید: قرض کی رسید کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنے کا عدم جواز علماء کرام کیلئے کوئی نئی بحث نہیں اور اسکے دلائل ذکر کرنا تحصیل حاصل کے زمرے میں شمار ہو گا لہٰذا خوف طوالت کی بنا پر اس سے سہو نظر کرتے ہیں، اس ضمن میں موطا امام مالکؒ میں یحییٰ سے روایت شدہ درج ذیل واقعہ راہنمائی کیلئے کافی ہے:

☆ مروان بن حکم کے دور میں جب مرکز سے رقم (درہم و دینار) پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو صوبے کے گورنر نے لوگوں کو بازار کی اشیاء خریدنے کیلئے رسیدیں جاری کر دیں جنہیں لوگوں نے خریدنا اور بیچنا شروع کر دیا۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے مروان سے کہا کہ کیا تم سود کو حلال کر رہے ہو؟ مروان نے کہا کہ میں اس چیز سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں؟ آپؓ نے فرمایا کہ پھر یہ رسیدیں کیا ہیں جنہیں لوگ خرید اور بیچ رہے ہیں؟ اسکے بعد مروان نے وہ رسیدیں لوگوں سے واپس لے لیں۔ اس روایت میں اہم بات یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے ان رسیدوں (promise of payment) کے استعمال کو سود کہا جنہیں لوگ اشیا کی خرید و فروخت کیلئے استعمال کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ قرض کی رسید (دین) کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے، یعنی قرض (دین) جس مال (عین) کی رسید ہو مبادلے سے قبل اس مال پر قبضہ کئے بغیر رسیدوں ہی کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنا درست نہیں۔ اسی اصول کو یوں بھی بیان کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا ہے کہ قرض کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔ شرع قرض کو ایک نجی معاہدے کی حیثیت دیتی ہے اور معاہدے کو نجی حیثیت سے نکال کر 'بطور آلہ مبادلہ' استعمال کرنا درست نہیں اور بینکاری (بشمول اسلامی بینکاری) درحقیقت اسی عمل کی آفاقیت کا دوسرا نام ہے۔

بینک زر بطور جعلی قرض کی رسید: اس صورت پر درج بالا کے علاوہ دو مزید اشکالات پیدا ہوتے ہیں:

ا۔ کیا شرعاً ایسا وعدہ کرنا جائز ہے جسے پورا کرنا عملاً ناممکن ہو اور وعدہ کرنے والا اس حقیقت سے واقف بھی ہو؟ اگر یہ جائز ہے تو کیا صرافوں کا ایسا کرنا بھی جائز تھا؟ اس سلسلے میں مجوزین کے نظریہ زر کے مطابق دوسری اہم بات یہ ہے کہ بینک کا زر درحقیقت افراط زر کا باعث بھی بنتا ہے جسکے نتیجے میں لوگوں کی قوت خرید اور اثاثوں کی مالیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور اس کا اثر ہر خاص و عام پر بلکہ غریب عوام پر زیادہ پڑتا ہے (۲۲)۔ یوں قوت خرید زر استعمال کرنے والے ایجنٹ سے زر تخلیق کرنے والے ایجنٹ (حکومت و بینک) کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طریقے سے لوگوں کی مال و دولت ہتھیا لینا شرعاً جائز ہے؟ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ (نساء: ۲۹)

'آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ، بلکہ باہمی رضامندی سے لین دین ہونا چاہئے''

ظاہر ہے فرضی زر تخلیق کر کے لوگوں کے مال ہتھیا لینے کا شمار تجارت میں نہیں ہو سکتا، پس اس طرح مال کھانا 'باطل' طریقوں سے لوگوں کے مال کھانے کے زمرے میں شامل ہوگا۔

۲۔ آخر اس بات کی کیا شرعی وعقلی دلیل ہے کہ ایک ایجنٹ (بینک یا حکومت) کو تخلیق زر کی کھلی اجارہ داری دے دی جائے اور وہ محض زر تخلیق کر کے رقم بناتا پھرے (۲۳)؟ ظاہر ہے بینک جو زر تخلیق کرتا ہے ایک طرف وہ اسے قرض پر دیکر نفع کماتا ہے تو دوسری طرف ان (جعلی) قرضوں کو بطور اثاثہ بنا کر ان کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ اگر ایسا کرنا ٹھیک ہے تو سب لوگوں کو اس چیز کی قانونی اجازت ملنی چاہئے کہ وہ اپنے اپنے نوٹ چھاپ کر (یا سرکاری نوٹوں کی فوٹو کاپیاں بنا کر) استعمال کریں۔

۲.۳: دفاع بینکاری کے لایعنی عذر

جب بینکنگ کے درست تصور کی حقیقت واضح کر دی جائے تو مجوزین بے سروپا تاویلوں اور عذروں کی بنیاد پر اسکا جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں چند ایک کا ذیل میں مختصر تجزیہ کیا جاتا ہے۔

☆ **تمام لوگ کبھی بینک سے اصل زر نکلوانے نہیں آتے، لہذا بینکنگ درست ہوئی:** اس عذر کا اصل بحث سے کچھ لینا دینا ہی نہیں، دھوکہ آخر دھوکہ ہے چاہے کوئی اس کی شکایت کرے یا نہ کرے۔ اگر کوئی شخص مہارت کے ساتھ لوگوں کی جیب کاٹتا رہے اور کسی کو معلوم نہ ہو نیز کوئی اسکے خلاف مقدمہ بھی درج نہ کرائے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس طرح چوری کرنا درست عمل ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

☆ **بینک یہ سب حکومت کی اجازت سے کرتا ہے:** یہ عذر بھی غیر متعلق ہے کیونکہ حکومت کا کسی فعل کو جائز کہہ دینا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ شرعاً بھی جائز ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یورپ میں شراب کی خرید وفروخت اور زنا حکومت اور قانون کی اجازت سے کیے جاتے ہے تو کیا یہ سب بھی جائز ہونگے؟ اسی طرح مسلم ممالک میں سودی لین دین بھی حکومت کی اجازت ہی سے ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حکومت کو شریعت کی پابندی کرنا ہے نہ کہ شرع کو حکومت کی

☆ **سو فیصد reserve (۲۴) بینکنگ کے ساتھ بینکاری جائز ہوگی:** یہ کہنے والے حضرات درحقیقت بینکاری کو سمجھے نہیں، اوپر یہ واضح کیا گیا کہ جب تک اکانومی میں ایک ایسا ایجنٹ موجود رہتا ہے جو بیک وقت رقوم وصول کرنے اور قرض دینے کا کام کرتا ہے اس وقت تک فرضی زر کی تخلیق کا عمل جاری رہے گا۔ یہ عمل صرف اس وقت ختم ہوگا جب اصل زر کے علاوہ اور کوئی شے بطور آلہ مبادلہ استعمال نہ کی جائے۔ ظاہر ہے اگر بینک سو فیصد reserve بینکنگ کے اصول پر کام کرنے لگیں تو وہ سرے سے بینک رہیں گے ہی نہیں کیونکہ اس صورت میں انکی قرض دینے کی صلاحیت سلب ہوجائے گی۔ پھر فرض کریں اگر اس اصول کے مطابق بینکاری کی بھی جانے لگے تو یقین مانئے صفحہ ہستی سے ختم ہونے والا سب سے پہلا کاروبار بینکاری ہی ہوگا کیونکہ اس صورت میں یہ ہرگز بھی نفع بخش نہ رہے گا۔ بینکوں کی آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں، خوبصورت فرنیچر، ان کے ملازمین کی لاکھوں روپے کی تنخواہیں وغیرہ درحقیقت وہ ثمرات ہیں جن کا حصول سو فیصد reserve بینکنگ میں ممکن نہیں رہتا۔ آخری بات یہ کہ فی الوقت دنیا میں اس اصول کے مطابق بینکاری (بشمول اسلامی بینکاری) کی ہی کہاں جارہی ہے کہ ہم اس فرضی اور غیر موجود امکان کو بنیاد بنا کر حاضر وموجود کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کریں؟

☆ **بینک زر کا استعمال عموم بلویٰ کی بنا پر ناگزیر ضرورت بن چکا ہے:** مجوزین کا یہ ایک عمومی حربہ ہے کہ اولاً وہ اپنے حق میں اصولی جواز اور دلائل پیش کرتے ہیں مگر جب ان کے تمام دلائل کو علمی طور پر رد کر دیا جائے تو پھر 'ضرورت کی دہائی' دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اسلامی بینکاری کے حق میں نظریہ ضرورت کا تجزیہ راقم نے اپنے مضمون 'سودی بینکاری کے فلسفہ متبادل کا جائزہ' میں تفصیل سے پیش کیا ہے، قارئین اسے وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ فرض کریں یہ مان لیا کہ بینک زر ایک ایسی برائی ہے جو عام ہوچکی ہے، مگر اس کے بعد سوال یہ ہے کہ اسلامی بینکاری کے نام پر برائی کے فروغ میں حصے دار بن جانا کہاں کی عقل مندی ہے؟ درحقیقت ضرورت کے تحت حرام کو حلال کرنے کا مقصد ایسے ماحول کو ختم کر دینا ہوتا ہے جو حرام کو ضرورت بناتا ہے نہ یہ کہ اس ماحول کو ہمیشہ کیلئے قائم ودائم رکھنا۔ دوسری بات یہ کہ کسی حرام فعل کا عام ہوجانا اسکے حلال ہوجانے کی دلیل نہیں بن جاتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر سب سے پہلے تو سود ہی کو حلال ہوجانا چاہئے کہ موجودہ دور میں اس سے زیادہ عام اور کوئی دوسری وبا نہیں

☆ **جزوی اصلاح کی کوشش میں خرابی کیا ہے؟** درج بالا بحث کے بعد اسلامی بینکاری کے حق میں ایک عذر یہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ موجودہ نظام باطل مگر غالب نظام ہے، نیز فی الحال ہمارے پاس اتنی قوت نہیں کہ ہم اسے تہس نہس کر سکیں۔ لہٰذا اگر پورے شر سے بچنے کیلئے موجود نظام کی جتنی اصلاح فی الحال ممکن ہو وہ کر لی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ ظاہر ہے بڑے شر کے مقابلے میں چھوٹے شر کو اپنانا شرع کا بھی حکم ہے اور عقل کا تقاضا بھی۔ اصولی طور پر یہ دعوی درست ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس حکمت عملی کے تحت جس شے کو اپنایا جا رہا ہے اسے 'شر' سمجھ کر احساس گناہ کے ساتھ ہی اختیار کیا جائے، اس پر 'اسلامی' کا لیبل چسپاں کر کے نہ تو اسلام کو بدنام کیا جائے اور نہ ہی آنے والی نسلوں کو 'شر' پر راضی رہنے کا جواز فراہم کیا جائے۔ موجود نظام کی کسی اداراتی تنظیم کی اصلاح کر کے اسے اسلامی قرار دینے کے لیے دو شرائط کا پورا ہونا لازم ہے:

(۱) تبدیلی کے بعد اس شے کا قواعد شریعہ کے مطابق ہونا ممکن ہو اور واقعتاً وہ ایسی ہو بھی جائے

(۲) تبدیلی کے بعد وہ شے مقاصد الشریعہ کے حصول کا ذریعہ بھی بن جائے

اگر ماہرین اسلامی بینکاری یہ ثابت کر دیں کہ اسلامی بینکاری ان دونوں شرائط پر پوری اترتی ہے تو فبہا، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مگر اصل مسئلہ یہی ہے کہ اولاً نہ تو قواعد شریعہ کے مطابق بینکاری ممکن ہے اور جو شے عملاً 'اسلامی بینکاری' کے نام پر موجود ہے وہ بھی قواعد شریعہ کے مطابق نہیں، دوئم موجود اسلامی بینکاری مقاصد الشریعہ کے بجائے سرمایہ دارانہ مقاصد کے حصول میں مصروف عمل ہے۔ جب اسلامی بینکاری کے معاملے میں یہ دونوں شرائط ہی مفقود ہیں تو پھر اسے 'اسلامی' کہنے کا جواز ہی کیا ہے؟ اگر مجوزین یہ مان لیں کہ اسلامی بینکاری اصولاً 'ناجائز بینکاری' ہے تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں رہے گا کیونکہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ ماہرین اسلامی معاشیات اسلام کے نام پر ایک غیر اسلامی شے کو کیوں فروغ دے رہے ہیں؟ بلکہ اسلامی بینکاری کو ضرورت کا شاخسانہ کہنے کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کا نام اسلامی بینکاری کے بجائے 'حرام بینکاری' رکھا جائے تاکہ لوگ اسے بطور ایک برائی سمجھ کر کم سے کم استفادہ کریں نیز ان میں اس سے بچنے کا جذبہ بھی بیدار ہو۔

۳.۳: متبادل کیا ہے؟

یہ سوال کہ اگر بینکاری نہ کریں تو کیا کریں، تو اسکا اصولی جواب یہ ہے کہ ہماری جدوجہد کے دو بنیادی مقاصد ہونے چاہئیں:

☆ اولاً سرمایہ داری اور اسکے تمام مظاہر اداروں (خصوصاً کارپوریشن، بینک اور اسٹاک ایکسچینج) سے گلوخلاصی حاصل کرنا۔

☆ ثانیاً زر حقیقی (سونے چاندی) پر مبنی مالیاتی نظام کا احیا۔

ایسی ہر جدوجہد جو سرمایہ دارانہ ریاستی و اداراتی صف بندی 'کے اندر' رہتے ہوئے اسلامی اصلاح کو مطمع نظر بنائے گی وہ بالآخر سرمایہ داری ہی کی تصویب کا باعث بنے گی (۲۵)۔ یہ مسئلہ کہ درج بالا مقاصد کے حصول کو ممکن بنانے والی جدوجہد کیسے مرتب کی جا سکتی ہے تو یہ الگ موضوع ہے جسکی تفصیلات بیان کرنا یہاں ممکن نہیں، اس نوع کی جدوجہد اور اسکے خدوخال جاننے کیلئے نوٹ نمبر ۲۶ میں جن کتب کا حوالہ دیا گیا ہے انکا مطالعہ کیا جا سکتا ہے (۲۶)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نتائج

مضمون کا اختتام ہم چند اصولی کلمات پر کرتے ہیں:

۱۔ مجوزین جس نظریہ بینکنگ کی بنیاد پر اس کی اسلام کاری ممکن سمجھتے ہیں، وہ نظریہ ہی سرے سے غلط ہے۔ دوسرے لفظوں میں جواز اور امکان اسلامی بینکاری کی کل عمارت غلط نظریات پر قائم ہے۔

۲۔ جس چیز کو بینکاری کہتے ہیں اسکی اسلام کاری کا کوئی امکان موجود نہیں کیونکہ بینکاری کی اسلام کاری ثابت کرنے کے لیے یہ ماننا لازم ہے کہ شرعاً قرض کو بطور آلہ مبادلہ استعمال کرنا جائز ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ شرعاً جھوٹا وعدہ کرنا اور جعلی قرض کی رسیدیں چلانا بھی جائز ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام مفروضات باطل ہیں۔

۳۔ شرکت ومضاربت کے اصولوں کے مطابق تمویل درست ہوسکتی ہے بشرطیکہ یہ معاہدات دو افراد کا نجی معاملہ رہیں۔ ثمن حقیقی پر مبنی مالیاتی نظام میں بینک کو شرکت ومضاربت کے اصولوں پر چلانا ممکن نہیں۔

درحقیقت درست اسلامی تمویل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے مدارس اور اسلامی تحریکات کے تحت منظم نہ کیا جائے۔ نفع خوری کو بڑھاوا دینے کے لیے قائم کردہ نجی تمویلی نظام سرمایہ داری ہی کی تقویت کا باعث بنے گا نہ کہ احیائے اسلام کا۔

اگر اہل علم حضرات مضمون کے تجزیئے میں کوئی سقم اور غلطی محسوس کریں تو اسپر مطلع کر کے ہماری راہنمائی فرمائیں۔ وما علینا الا البلاغ

ضمیمہ بابت 'اسلامی بینکاری: غلط سوال کا غلط جواب'

اس ضمیمے میں ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ بینکاری نظام fractional reserve banking کے جس اصول کے تحت چلتا ہے، وہ کیسے کام کرتا ہے۔ تفہیم مباحث کیلئے اپنی گفتگو کو ہم چند سطحوں پر تقسیم کئے دیتے ہیں۔

پہلی سطح: ایک ایسی اکانومی کا تصور کیجئے جہاں کسی قسم کا کوئی بینک موجود نہیں اور تخلیق زر کا واحد ذریعہ صرف حکومت کا مرکزی بینک ہے۔ فرض کریں مرکزی بینک 1000 روپے کے نوٹ چھاپ دیتا ہے (یہ نوٹ وہ کس چیز کے عوض چھاپتا ہے یہاں ہم اس بحث سے اغماز کرتے ہیں) اور حکومت یہ اعلان کر دیتی ہے کہ آج کے بعد قرضوں کی ادائیگی صرف ان نوٹوں کی صورت میں ہی تسلیم کی جائے گی۔ مرکزی بینک کی بیلنس شیٹ کچھ اس طرح دکھائی دے گی:

مرکزی بینک کی بیلنس شیٹ			
اثاثے		واجب الادا ادائیگیاں	
قرض	1000	کرنسی	1000

اس صورت حال میں چونکہ سارا کا سارا زر کرنسی کی صورت میں موجودہ ہے لہذا زر کی رسد برابر ہوگی کل کرنسی کی رسد کے، یعنی:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زر کی رسد = کرنسی نوٹ

دوسری سطح: فرض کریں کہ ایسے کمرشل ادارے یا بینک قائم ہوتے ہیں جو قرض نہیں دیتے بلکہ انکا مقصد محض لوگوں کی بچتوں وغیرہ کی حفاظت کرنا ہے۔ بحث کو آسان کرنے کیلئے فرض کریں کہ لوگ سارے سرکاری نوٹ ان بینکوں میں جمع کرادیتے ہیں اور خرید وفروخت کیلئے بینکوں کی رسیدیں استعمال کرنے لگتے ہیں (ارتقاء بینکنگ میں صرافوں کا دوسرا دور)۔ اس مثال میں چونکہ بینکوں نے تمام ڈپازٹس اپنے پاس بطور reserves رکھے ہیں لہذا اس بینکاری نظام کو 100% reserve banking (سو فیصد reserve بینکنگ) کہتے ہیں۔ کمرشل بینکوں کی بیلنس شیٹ کچھ یوں ہوگی:

کمرشل بینکوں کی بیلنس شیٹ			
اثاثے		واجب الاداادائیگیاں	
Reserves (Cash)	1000	ڈپازٹس	1000

اب چونکہ سارا کا سارا زر ڈپازٹس کی صورت میں استعمال ہورہا ہے لہذا زر کی رسد برابر ہوگی بینکوں کے کل ڈپازٹس کے، یعنی:

زر کی رسد = بینک ڈپازٹس

تیسری سطح: درج بالا دو سطحیں محض تفہیم کے لیے بیان کی گئیں تھیں کیونکہ حقیقتاً کوئی بھی بینک سو فیصد reserve بینکنگ کے اصول پر کام نہیں کرتا (اور نہ ہی کرسکتا ہے)۔ اب فرض کریں کہ بینک اپنے ڈپازٹس کا ایک حصہ (مثلاً 20%) اپنے پاس بطور reserves رکھ کر بقیہ رقم قرض کے طور پر چلاتے ہیں۔ کیونکہ اب بینک اپنے ڈپازٹس کا محض ایک حصہ اپنے پاس رکھتے ہیں لہذا اس نظام بینکاری کو fractional reserve banking (سو فیصد سے کم reserve بینکاری) کہتے ہیں۔ بینک کل ڈپازٹس کے جتنے فیصدی حصے کو بطور reserves رکھتے ہیں اسے reserve requirement (*rr*) یا reserve ratio کہا جاتا ہے (ہماری مثال میں *rr* بیس فیصد ہے)۔ reserve ratio کتنا ہونا چاہئے اسکا فیصلہ عموماً مرکزی بینک کرتا ہے۔ ان *reserves* کو اپنے پاس رکھنے کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ لوگ اپنی روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لیے کرنسی نوٹ بینکوں سے نکلواتے رہتے ہیں (وہ اور بات ہے کہ یہ نوٹ بالآخر گھوم کر پھر بینکوں کے پاس ہی آجاتے ہیں، کسی مخصوص وقت میں کرنسی نوٹوں کا ایک محدود حصہ ہی نظام بینکاری سے باہر لوگوں کے پاس موجود ہوتا ہے)۔ بینکوں کے پاس زیادہ reserves بچ رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انہیں خاطر خواہ مقدار میں قرض کے قابل بھروسہ طلب گار نہیں مل پاتے۔ الغرض اس نظام میں ڈپازٹس کے دو حصے ہوجاتے ہیں، ایک وہ جو reserves کی شکل میں رکھ لیا جاتا ہے اور دوسرا وہ جو قرض کی صورت میں دے دیا گیا۔ بینک موخر الذکر پر سود کماتا ہے جبکہ اول الذکر پر وہ کچھ نہیں کماتا۔

اس اصول بینکاری کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ اکانومی میں بہت سے بینک ہیں اور ابتداً سو روپے کے ڈپازٹس بینک الف میں جمع کرائے گئے تھے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ اب 1000 روپے کے ڈپازٹس کا بیس فیصد یعنی 200 روپے بطور reserves بینک الف کے پاس محفوظ ہونگے جبکہ بقیہ 800 روپے وہ زید کو قرض پر دے دیتا ہے (عملاً بینک کچھ رقم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذاتی سرمایہ کاری کیلئے بھی استعمال کرتا ہے مگر یہاں ہم اس سے سہو نظر کرتے ہیں کیونکہ اسکا تخلیق زر کے عمل سے کوئی تعلق نہیں)۔اب بینک الف کی بیلنس شیٹ کچھ یوں ہوگی:

بینک الف کی بیلنس شیٹ			
اثاثے		**واجب الادا ادائیگیاں**	
Reserves	200	ڈپازٹس	1000
قرضے	800		

بینک عموماً قرض نوٹوں وغیرہ کی صورت میں نہیں دیتے بلکہ اسکا طریقہ صرف یہ ہوتا ہے کہ زید کا ایک اکاؤنٹ کھول کر اسے چیک بک جاری کردی جاتی ہے اور یوں قوت خرید زید کو منتقل ہوجاتی ہے۔مگر فرض کریں کہ بینک الف زید کو نوٹوں کی صورت میں قرض دیتا ہے۔ چونکہ اس سطح تک ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ لوگ نوٹوں کے بجائے صرف بینکوں کی رسیدیں ہی بطور کرنسی استعمال کرتے ہیں تو زید یا تو اس رقم کو بینک الف میں اپنا اکاؤنٹ کھول کر جمع کروادے گا اور یا پھر کسی دوسرے بینک (مثلاً بینک ب) میں جمع کروائے گا۔فرض کریں یہ رقم وہ بینک ب میں جمع کرواتا ہے۔ چونکہ بینک ب بھی اپنے ڈپازٹس کا محض بیس فیصد ہی اپنے پاس reserves کی صورت میں رکھتا ہے، لہٰذا وہ 800 روپے میں سے 160 روپے اپنے پاس رکھے گا جبکہ بقیہ 640 روپے بطور قرض آگے بڑھادے گا۔ بینک ب کی بیلنس شیٹ کچھ اس طرح دکھائی دے گی:

بینک ب کی بیلنس شیٹ			
اثاثے		**واجب الادا ادائیگیاں**	
Reserves	160	ڈپازٹس	800
قرضے	640		

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ اب دونوں بینکوں کے کل ڈپازٹس ملا کر 1800 روپے ہوگئے، یعنی اب زر کی کل مقدار 1800 روپے ہوگئی کیونکہ اب بینکوں کی 1800 روپے مالیت کی رسیدیں یا چیک بطور زر استعمال ہو رہے ہیں۔ظاہر ہے قرض دینے کا یہ عمل ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ اگر بینک ب نے 640 روپے کا یہ قرض ناصر کو دیا ہے تو ناصر اسے اسی بینک میں یا بینک ج میں کروادے گا۔ بینک ج بھی اس رقم 640 روپے کا بیس فیصد اپنے پاس رکھ کر بقیہ ادھار پر چلا دے گا جسکے نتیجے میں بینک ج کی بیلنس شیٹ ذیل ہوگی:

بینک ج کی بیلنس شیٹ			
اثاثے		**واجب الادا ادائیگیاں**	
Reserves	128	ڈپازٹس	640
قرضے	512		

اب مجموعی ڈپازٹس یعنی زر کی کل رسد بڑھ کر 2,440 روپے ہوگئی۔ یہ عمل بینک ج سے آگے چلتا رہے گا۔ ہم دیکھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکتے ہیں کہ ہر چکر میں قرضوں سے تخلیق ہونے والے ڈپازٹس کم ہوتے چلے جا رہے ہیں لہذا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ عمل کسی مقام پر جا کر ضرور ختم ہو جائے گا۔ یہ سوال کہ اس عمل کے اختتام پر کل ڈپازٹس کتنے ہوں گے تو اسے درج ذیل فارمولے سے اخذ کیا جا سکتا ہے:

زر کی کل رسد = $(1/rr)$ × اول ڈپازٹس

ہماری مثال میں rr بیس فیصد جبکہ اول ڈپازٹس 1,000 روپے فرض کئے گئے تھے، تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ بینک 1,000 روپے کے ڈپازٹس سے مجموعی طور پر 5,000 روپے کے ڈپازٹس تخلیق کر دے گا:

زر کی کل رسد = $(1/0.20) \times 1000 = 5000$

ان پانچ ہزار کے ڈپازٹس میں سے ایک ہزار کی پشت پر تو مرکزی بینک کے اصل نوٹ (جنہیں اصل ڈپازٹس کہا گیا ہے) ہونگے جبکہ دیگر چار ہزار قرض کی صورت میں تخلیق ہوئے۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لینی چاہئے کہ نئے بینک ڈپازٹس درحقیقت قرضوں سے جنم لے رہے ہیں۔ تمام بینکوں کی مجموعی بیلنس شیٹ کچھ اس طرح دکھائی دے گی:

تمام بینکوں کی مجموعی بیلنس شیٹ			
اثاثے		واجب الادا ادائیگیاں	
Reserves	1000	ڈپازٹس	5000
قرضے	4000		

دھیان رہے کہ نظام بینکاری چار ہزار کے یہ قرض ان معنی میں بلا کسی عوض تخلیق کرتے ہیں کہ انہیں ادا کرنے کیلئے انکے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ زر کی یہ مقدار محض کمپیوٹر کی یادداشت میں محفوظ ہوتی ہے۔ ڈپازٹس تخلیق کرتے وقت اصولاً بینک یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ان تمام ڈپازٹس کے مالکان جب چاہیں اپنے ڈپازٹس کو حکومتی نوٹوں میں تبدیل کروا سکتے ہیں مگر حقیقتاً یہ ایک ناممکن الوفا وعدہ ہوتا ہے۔ اگر تمام لوگ ایک ہی وقت میں بینکوں سے اپنے ڈپازٹس طلب کر لیں تو بینک دیوالیہ ہو جائیں گے کیونکہ انکے پاس ڈپازٹس کے مساوی رقم کبھی موجود ہی نہیں ہوتی۔ جب کبھی ایسے حالات پیش آئیں کہ لوگ بینکوں کے پاس موجود reserves سے زائد رقم طلب کرنے لگیں تو ایسی صورت میں بینک مصیبت سے دوچار ہو جاتے ہیں اور اس موقع پر مرکزی بینک انہیں قرض فراہم کر کے ان کے reserves میں اضافہ کر دیتا ہے (مرکزی بینک کے اس کردار کو lender of the last resort کہتے ہیں)۔ یاد رہے کہ مرکزی بینک بھی یہ قرض بلا کسی عوض تخلیق کرتا ہے۔ گویا جھوٹ اور فریب کے اس نظام کو بحران سے بچانے کے لیے ریاستی جبر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کھاتے داروں کی ڈپازٹس سے زیادہ رقم طلب کرنے کی وجہ سے بینکوں کے مصیبت میں پھنس جانے کی ایک مثال سن ۱۹۸۵ میں شمال مشرقی امریکی ریاستوں کے بینکوں کا دیوالہ ہو جانا تھا۔ اسی طرح ۲۰۰۱ میں ارجنٹائن کے بینکوں کی مثال بھی موجود ہے جہاں کھاتے داروں کو اپنے ڈپازٹس سے رقم نکلوانے اور بینک کے اندر داخل ہونے سے روکنے کے لیے باقاعدہ پولیس فورس کا استعمال کیا گیا۔ بعض اوقات پورے بینکاری نظام کو دیوالیہ پن سے بچانے کے لیے کسی ایک بینک کو بند کر کے اس کی قربانی دے دی جاتی ہے۔ اسی طرح ماضی قریب میں پاکستان میں جب بینک الفلاح سے متعلق افواہیں اڑنے لگیں تو لوگ بڑی تعداد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اپنے ڈپازٹس بینک سے نکلوانے لگے اور بینک کی مالی ساخت بری طرح متاثر ہونے لگی۔ اس موقع پر عوام میں بینک کی ساخت بحال کرنے کیلئے حکومت و مرکزی بینک کو مداخلت کرنا پڑی اور اعداد و شمار کے ذریعے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ بینک الفلاح ایک نہایت مضبوط اور قابل اعتبار بینک ہے۔ الغرض بینکاری کا جو نظام بظاہر نہایت ہموار اور محفوظ طرز پر چلتا دکھائی دیتا ہے، اس کی وجہ اس کی پشت پر ریاستی جبر و ذرائع کا موجود ہونا ہے۔

بینک زر کی یہ فرضی مقدار کیسے تخلیق کرتے ہیں اسکی وضاحت اصل مضمون میں کی گئی تھی کہ بینک جب کسی شخص کو قرض دیتا ہے تو وہ کسی ایک شخص کی قوت خرید کسی دوسرے فرد کو منتقل نہیں کرتا بلکہ نئے سرے سے نئی قوت خرید تخلیق کرتا ہے۔ اس بحث سے یہ سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ آخر بینک کرنسی (cash) کے بجائے اپنے کارڈز (ATM, Debit and Credit cards) کو فروغ دینے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ بینکار (ابتداً صراف) خوب جانتے تھے (اور جانتے ہیں) کہ وہ عوام الناس کو محض دھوکہ دے کر جھوٹے وعدے کر رہے ہیں لہٰذا وہ شعوری طور پر اس چیز کی کوشش کرتے کہ لوگ کرنسی (سونے چاندی یا نوٹوں) کے بجائے بینک کی رسیدیں و چیک بطور آلہ مبادلہ استعمال کریں اور لوگوں کی ترجیحات میں یہ تبدیلی لانے کے لیے کئی مارکیٹنگ ہتھکنڈے بطور ہتھیار استعمال کیے گئے (اور کیے جاتے ہیں)، مثلاً:

☆ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بینکوں کی برانچیں شہر کے اہم مقامات پر کھولی جاتیں اور ان برانچوں کو خوبصورت بنانے کے لیے ہر قسم کے سامان تعیش سے مزین کیا جاتا۔

☆ مختلف حیلوں بہانوں سے لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا کہ سونے اور نوٹ وغیرہ استعمال کرنا ٹھیک نہیں (مثلاً انہیں استعمال کرنا محفوظ نہیں وغیرہ)۔

☆ اشتہارات کے ذریعے لوگوں کو بینکوں کے فراہم کردہ کرنسی کے متبادل ذرائع (مثلاً کارڈز اور ٹریولرز چیک وغیرہ) استعمال کرنے کی ترغیب دینا۔

☆ ہر بڑے شاپنگ سینٹر وغیرہ پر کرنسی کی جگہ بذریعہ بینک کارڈ زخریداری کی سہولت فراہم کرنا (یورپ وغیرہ میں اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ اگر آپ کے پاس بینک کارڈ کے بجائے سرکاری نوٹ ہیں تو آپ کے لیے خریداری کرنا مشکل ہو جائے گی کیونکہ ہر بڑا دوکاندار اور شاپنگ سینٹر کیش کے بجائے کارڈ کی صورت میں ادائیگی کو ترجیح دیتا ہے)۔

☆ حکومتی مدد سے بہت سی خرید و فروخت اور ادائیگیوں کیلئے کرنسی کے بجائے بینک زر کو قانوناً لازم قرار دینا۔

ان سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ جھوٹ اور دھوکے پر مبنی بینکاری نظام کو محفوظ طریقے سے قابل عمل رکھا جا سکے اور بینکوں کو کم از کم رقم اپنے پاس بطور reserves رکھنا پڑے کیونکہ اوپر دیئے گئے فارمولے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ reserve ratio (*rr*) جتنا زیادہ ہوگا بینکوں کی قرض دینے کی صلاحیت اتنی ہی کم ہوگی۔ اگر reserve ratio صفر کر دیا جائے تو بینک لامحدود قرض دینے کی صلاحیت حاصل کرلیں گے، یعنی لوگ جس قدر قرض چاہیں بینک سے حاصل کر کے ادائیگیوں کیلئے استعمال کر سکیں گے اور بینک ان کی یہ طلب پوری کرنے کا مکلّف ہوگا (معاشیات کے Post Keynasian فرقے خصوصاً Kaldor وغیرہ کے پیروکار اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں کہ بینک جتنی قوت خرید چاہے پیدا کر سکتا ہے، مرکزی بینک کا کام ایسی زری پالیسی بنانا ہوتا ہے جو زر کی کسی بھی مخصوص طلب کے جواب میں تخلیق کئے گئے زر کو regulate

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکے)۔ درحقیقت Electronic money کا استعمال جس رفتار سے بڑھے گا بینکوں کی لامحدود قرض دینے کی صلاحیت میں بھی اسی رفتار سے اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہی وجہ ہے کہ بینک ہمیشہ electronic money کے استعمال اور اسکے فروغ کو ترویج دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

چوتھی سطح: اس تجزیئے کی چوتھی سطح یہ ہوگی کہ ہم یہ فرض کریں کہ لوگ بینک ڈپازٹس کے علاوہ سرکاری نوٹ بھی بطور آلہ مبادلہ استعمال کرتے ہیں۔ اس صورت میں درج بالا فارمولا ذرا پیچیدہ ہو جائے گا جس کی تفصیلات بیان کرنا یہاں ایک تو نہایت مشکل امر ہے، نیز اس بحث سے درج بالا نتیجے (کہ بینک فرضی زر تخلیق کرتا ہے) میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی (سوائے اس سے کہ بینک کی اس صلاحیت میں ذرا کمی آجاتی ہے)۔ لہٰذا ہم اس بحث سے صرف نظر کرتے ہیں، شوقین حضرات اسکی تفصیلات macroeconomics کی درسی کتب میں ملاحظہ کر سکتے ہیں (مثلاً دیکھئے Abel and Barnanke کی کتاب Macroeconomics)۔

اس بحث سے درج ذیل باتیں واضح ہوئیں:

۱۔ بینک قرض بچتوں سے نہیں دیتے، یعنی بینک ہرگز ایک زری ثالث نہیں ہوتا۔

۲۔ بینک 'قرضے ڈپازٹس کا باعث بنتے ہیں' کے اصول پر کام کرتا ہے۔

۳۔ بینک کے قرض کبھی بھی بچتوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔

۴۔ بینک جو زر تخلیق کرتا ہے، وہ قرض کی صورت میں (یعنی debt money) ہوتا ہے۔

۵۔ نظام بینکاری مالیاتی وزری نظام کو قرض پر مبنی زر پر منتج کرتا ہے۔

۶۔ چونکہ مرکزی اور کمرشل بینک یہ قرض سود پر دیتے ہیں، لہٰذا بینک سود کو بذریعہ debt money پورے معاشروں پر غالب کر دیتے ہیں۔ (انہی معنی میں آج ہر وہ شخص جو ریاستی نوٹ اور بینک کے چیک استعمال کرتا ہے درحقیقت سود کھا رہا ہے)۔

۷۔ بینکنگ فی الحقیقت جھوٹ، فریب اور چال بازی پر مبنی ہے۔

۸۔ بینک کی اصل آمدن کا ذریعہ یہی جھوٹ اور فریب پر مبنی وعدے ہوتے ہیں۔

۹۔ مرکزی بینک کے بغیر بینکاری کا یہ نظام محفوظ طریقے سے چلنا نہایت مشکل امر ہے۔

بینک سرکاری نوٹوں کے مقابلے میں کس قدر زیادہ زر جاری کرتے ہیں اسے سمجھنے کیلئے سٹیٹ بینک آف پاکستان کے جون ۲۰۰۸ کے یہ اعداد وشمار ہی کافی ہیں:

متعلقہ تفصیل	مالیت (ملین روپوں میں)
کل کرنسی نوٹ (M1)	982,325 (نو کھرب بیاسی ارب)
بینک ڈپازٹس ملا کر کل جاری کردہ زر (M2)	4,689,143 (چھیالیس کھرب نواسی ارب)
کرنسی نوٹوں کے مقابلے میں بینک زر کا تناسب	4.77

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کمرشل بینکوں نے مرکزی بینک کے ہر ایک نوٹ کے بدلے تقریباً پونے پانچ روپے تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈپازٹس جاری کر دیے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اکانومی میں کل زر کا صرف بیس فیصد نوٹوں کی شکل میں جبکہ بقیہ قرض پر مبنی جاری کردہ رسیدوں (ڈپازٹس) کی صورت میں موجودہ ہے (یہاں بینکوں کا اپنے کھاتے داروں سے یہ وعدہ بھی یاد رہے کہ وہ جب چاہیں اپنے ڈپازٹس کو نوٹوں میں تبدیل کروا سکتے ہیں)۔ پاکستان کے مقابلے میں دیگر ترقی یافتہ ممالک جہاں زر کی مارکیٹیں بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں یہ تناسب اس سے بھی زیادہ ہے (مثلاً برطانیہ میں یہ تناسب نوے فیصد سے بھی زیادہ ہے)۔ ان اعداد و شمار سے دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کل زر کا بڑا حصہ کمرشل بینک جاری کرتے ہیں نہ کہ مرکزی بینک (جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے)۔

حواشی

۲۱۔ جو لوگ نظام بینکاری کی حقیقت اور وہ معاشی ماحول جس میں یہ کام کرتا ہے اسے درست طریقے سے سمجھنے سے قاصر رہے وہ اسلامی تاریخ میں بینک تلاش کرنے کی غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ مجوزین میں سے بعض کا یہ دعوی ہے کہ بینکاری کی ابتدا امام ابوحنیفہؒ سے ہوئی جن کے پاس لوگ اپنی امانتیں رکھواتے اور وہ انہیں کاروبار کیلئے آگے قرض وغیرہ پر دے دیا کرتے۔ فرض کریں مجوزین کا یہ دعوی تاریخی طور پر درست ہے کہ امام صاحب ایسا کیا کرتے تھے، مگر سوال تو یہ ہے کہ اس سارے عمل سے بینک کی صورت کہاں پیدا ہوئی؟ بینکنگ کی صورت حال تب پیدا ہوتی ہے جب قرض نجی معاملے سے آگے بڑھ کر آلہ مبادلہ کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ کیا امام صاحب (۱) پھر انہی مقروض لوگوں سے دوبارہ امانتیں (deposits) وصول کر کے اپنے فنڈ میں جمع کر لیا کرتے تھے جنہیں وہ قرض دیا کرتے تھے؟ اور (۲) اپنے قرض خواہوں اور مقروضوں کو اصل زر کے بجائے قرض کی رسیدیں بطور آلہ مبادلہ استعمال کیلئے جاری کیا کرتے تھے؟ اگر کوئی یہ کہے کہ امام صاحبؒ ایسا کرتے تھے تو وہ ان کی ذات پر بہت بڑا بہتان باندھے گا۔ درحقیقت امام صاحبؒ کے طرز عمل کو وہی شخص بینکنگ کہہ سکتا ہے جو نیو کلاسیکل نظریہ بینکاری کو درست سمجھنے کی غلط فہمی کا شکار ہو۔

۲۲۔ غریب طبقے پر زیادہ اثرات اس لیے پڑتے ہیں کہ اسے اضافی (relative) اعتبار سے قوت خرید میں زیادہ کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۲۳۔ یعنی ایک مزدور دن رات محنت کر کے اپنی روزی کمائے، کارخانے دار اپنے سرمائے کو کاروبار میں لگا کر آمدن کمائے مگر بینک محض زر تخلیق کر کے مزے کرتا پھرے؟

۲۴۔ Reserve سے مراد کل ڈپازٹس کا وہ حصہ ہے جسے بینک کرنسی (Cash) کی شکل میں اپنے اور مرکزی بینک کے پاس جمع رکھتے ہیں۔ سو فیصد reserve banking کا مطلب ایسی بینکاری ہے جہاں بینک کل ڈپازٹس کے برابر (یعنی ڈپازٹس کا سو فیصد) reserve کی شکل میں اپنے پاس محفوظ رکھیں اور کسی قسم کا قرضہ جاری نہ کریں

۲۵۔ یہ بات درست ہے کہ موجودہ حالات میں علماء خود کو اس امر پر مجبور پاتے ہیں کہ وہ لوگوں کو 'قابل عمل فتوے' دیں کیونکہ لوگ ان سے اسی مقصد کیلئے سوال کرتے اور اپنے مسائل کے حل کیلئے رجوع کرتے ہیں۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام کا مسلط کردہ یہ 'دائرہ جبر' تب ہی تو کم ہوگا جب علماء اس نظام سے باہر 'دائرہ اختیار' قائم کرنے اور اسے بڑھانے کی کوئی جدوجہد کریں گے۔ ہمیشہ ایسے فتوے دینے کی حکمت عملی پر کاربند رہنا جس کا مقصد لوگوں کے لیے خود کو موجود نظام کے اندر سمونا ممکن بنانا ہو (how to *fit in* the given environment) درحقیقت دائرہ جبر کو مزید بڑھانے کی حکمت عملی ہے۔ اسلامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بینکاری نہ صرف اس دائرہ جبر کو بڑھا رہی ہے بلکہ اس کے جبر ہونے کا احساس بھی دلوں سے نکال رہی ہے۔

۲۶۔ سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے اور اس کا مکمل انہدام کیوں ضروری ہے، اس کے لیے دیکھئے:

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، *'Rejecting Freedom and Progress'*، جریدہ ۲۹، کراچی یونیورسٹی

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، 'عالم اسلام اور مغرب کی کشمکش'، کتاب 'سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ' (ص: ۱۹۲-۲۴۵)

سرمایہ دارانہ معاشی و ریاستی صف بندی کی حقیقت جاننے کے لیے دیکھئے:

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، 'سرمایہ دارانہ معیشت'، کتاب 'سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ' (ص: ۱۱۰-۱۲۱)

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، 'لبرل سرمایہ دارانہ ریاست'، کتاب 'سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ' (ص: ۱۶۰-۱۸۲)

سرمایہ داری کے خلاف اسلامی انقلابی جدوجہد کے خدوخال کیا ہو سکتے ہیں اس کے لئے دیکھئے:

☆ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، 'جماعت اسلامی کی انقلابی جدوجہد برائے ۲۰۰۸-۲۰۱۳'، کتاب 'جمہوریت یا اسلام' (ص: ۲۶۳-۲۷۸)

بینکاری کا متبادل کیا ہو سکتا ہے، نیز زر اصلی کی طرف کیسے لوٹا جا سکتا ہے، اس کے لیے دیکھئے:

☆ یونس قادری، 'کھاتے دار تمویلی ادارے: ایک متبادل'، جریدہ ۳۷، کراچی یونیورسٹی پریس

☆ یونس قادری، 'Can we create our own Currency?'، *Pakistan Business Review* Vol 11 (1)

☆ Tarek Al Dewani، *History of Banking: An Analysis*، www.islamic-finance.com

☆ Tarek Al Dewani، *The Problem with Interest*، *Polity Press*

"اسلام اور مغرب تعلقات"

مجموعہ محاضرات از ڈاکٹر محمود احمد غازی

(دنیائے اسلام اور مغرب کے روابط، کش مکش اور باہمی تعلقات کی مختلف جہتوں اور حیثیتوں کا تاریخی، فکری اور تہذیبی مطالعہ)

—— ترتیب وتدوین: ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن ——

[صفحات: ۲۲۴۔ قیمت: ۱۹۰ روپے]

ناشر: زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے۔۴/۱۷، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی۔ فون: ۰۹۰ ۳۶۶۸۴۷-۱۲۰

© rasailojaraid.com